داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القُرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:

مختصر

بیانُ القرآن

ترجمہ مع منتخب حواشی

فری ہوم ڈلیوری کے ساتھ

- دیدہ زیب ٹائٹل
- مضبوط جلد
- 1248 صفحات

- ڈیلکس ایڈیشن: 4500 کے بجائے 2200 روپے
- سٹینڈرڈ ایڈیشن: 2500 کے بجائے 1500 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون (042)35869501-3

maktaba@tanzeem.org 0301-1115348

مسلسل اشاعت کے 60 سال

جمادی الاولیٰ ۱۴۴۷ھ

نومبر ۲۰۲۵ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- عظمتِ قرآن از ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ
- قافلہ تنظیم: منزل بہ منزل
- سرکاری ملازمین کا اخلاق و کردار
- سب سے کمزور گھر
- کیا امن معاہدہ امن لائے گا؟
- مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!
- اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ
- اسلامی تحریکوں کے ذمہ داران کے مطلوبہ اوصاف

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

”اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!“

ماہنامہ
میثاق
لاہور

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جلد : 74
شمارہ : 11
جُمادی الاُولیٰ 1447ھ
نومبر 2025ء
فی شمارہ : 50روپے
سالانہ زرِتعاون: 500روپے
اس شمارے کی قیمت 100 روپے

مدیر مسئول
شجاع الدّین شیخ

مدیر اعزازی
حافظ عاکف سعید

مدیر
حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت
• رضاء الحق • ایوب بیگ مرزا
• خورشید انجم • وسیم احمد

معاون مدیران
• محمد خلیق • حافظ محمد زاہد

مکتبہ خُدّامُ القرآن لاہور، K-36، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
فون: 3-35869501 (042) ، 0341-4941212
ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
publications@tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ”دارُالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375 (042)
ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

- **عرضِ احوال** — 5
  کیا امن معاہدہ امن لائے گا؟ — رضاء الحق
- **ابوظبی سیریز** — 10
  عظمتِ قرآن — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **درسِ قرآن** — 31
  سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۳) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **منبر و محراب** — 64
  سب سے کمزور گھر — شجاع الدین شیخ
- **حسنِ مُعاشرت** — 75
  سرکاری ملازمین کا اخلاق و کردار — شجاع الدین شیخ
- **ظروف و احوال** — 91
  مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ! — ایوب بیگ مرزا
- **دعوتِ فکر** — 97
  دورِ فساد میں نجات کی راہ — قیصر جمال فیاضی
- **جادہ و منزل** — 103
  قافلۂ تنظیم: منزل بہ منزل — خورشید انجم
- **دعوت و تحریک** — 122
  اسلامی تحریکوں کے ذمہ داران کے مطلوبہ اوصاف — مولانا صدرالدین اصلاحیؒ
- **حُسنِ عبادت** — 139
  اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ — ڈاکٹر ربیعہ ابرار
- **حقیقتِ دین** — 150
  اسماء اللہ الحُسنیٰ (۵) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان
- **تعارفِ کتب** — 160
  ہماری مطبوعات — پروفیسر الطاف طاہر اعوان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کیا امن معاہدہ امن لائے گا؟

قطع نظر اس بات سے کہ غزہ امن معاہدہ ہماری خواہشات اور تمنّاؤں کے مطابق ہوا ہے یا نہیں‘ آخر کار غزہ امن معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں۔ ذرائع کے مطابق اِس میں درج ذیل شقیں شامل ہیں:

(۱) غزہ ایسا علاقہ ہوگا جو انتہا پسندی سے پاک ہوگا‘ جو اپنی ہمسایہ ریاستوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں رکھے گا۔

(۲) غزہ کو دوبارہ ایسے انداز سے تعمیر کیا جائے گا کہ وہ وہاں رہنے والوں کی فلاح و بہبود کا باعث بنے۔

(۳) دونوں فریق اس تجویز کو قبول کریں‘ تو جنگ فوراً ختم ہو جائے گی۔ اسرائیلی افواج وہیں واپس جائیں گی جہاں معاہدے کے مطابق طے پایا ہے‘ تاکہ یرغمالیوں کی رہائی ممکن ہو۔

(۴) جب اسرائیل اس معاہدے کی عوامی منظوری دے دے‘ تو زندہ اور مردہ یرغمالیوں کی رہائی ۷۲ گھنٹوں کے اندر مکمل کی جائے گی۔

(۵) یرغمالیوں کی رہائی کے بعد‘ اسرائیل ۲۵۰ ایسے افراد جنہیں عمر قید کی سزا ہے‘ اور ۱۷۰۰ دیگر افراد کو رہا کرے گا جو جنگ شروع ہونے کے بعد غزہ سے گرفتار کیے گئے۔

(۶) یرغمالیوں کی رہائی کے بعد‘ حماس کے وہ کارکن جو پُرامن بقائے باہمی پر قائم رہنا چاہیں اور اپنے اسلحہ کو غیر فعال کرنے پر رضامند ہوں‘ اُنہیں معافی دی جائے گی۔ جو افراد غزہ چھوڑنا چاہیں گے‘ اُنہیں محفوظ راستہ دیا جائے گا۔

(۷) معاہدے کے قبول ہونے کے بعد‘ غزہ کو انسانی امداد بلا تاخیر فراہم کی جائے گی‘ جس میں پانی‘ بجلی‘ اسپتال‘ نالوں‘ سڑکوں وغیرہ کی بحالی شامل ہوں گی۔

(۸) امدادی سامان اور تقسیم کا عمل بلا رکاوٹ جاری رکھا جائے گا اور یہ کام اقوامِ متحدہ‘ ریڈ کریسنٹ‘ اور دیگر غیر جانب دار بین الاقوامی تنظیموں کے ذریعے کیا جائے گا۔

(۹) غزہ کی انتظامیہ عارضی ٹیکنوکریٹ کمیٹی کے سپرد کی جائے گی‘ جو عوامی خدمات انجام دے گی۔ اس کمیٹی کے کام کی نگرانی بورڈ آف پیس کرے گا‘ جس کی صدارت ڈونلڈ ٹرمپ کرے گا‘ اور اس میں ٹونی بلیئر سمیت بین الاقوامی ماہرین بھی شامل ہوں گے۔

(۱۰) بورڈ آف پیس غزہ کی تعمیرِ نو اور فنڈنگ کا فریم ورک ترتیب دے گا‘ اور وقت کے ساتھ فلسطینی اتھارٹی کو باقاعدہ کنٹرول منتقل کیا جائے گا‘ بشرطیکہ وہ اصلاحات مکمل کر لے۔

(۱۱) غزہ کی غیر عسکری حیثیت کو قبول کیا جائے گا‘ اور اس کی نگرانی غیر جانبدار مانیٹرز کریں گے۔

(۱۲) اسلحہ کو غیر فعال کرنے کا عمل بین الاقوامی مالی معاونت اور buy-back پروگرام کے تحت کیا جائے گا‘ جس کی تصدیق مانیٹرز کریں گے۔

اس موقع پر جاری کردہ اعلامیہ میں بتایا گیا ہے کہ اسے امن معاہدے کے دستخط کنندگان امریکہ‘ مصر‘ قطر اور ترکیہ نے جاری کیا ہے۔ جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

- ہم صدر ٹرمپ کی سنجیدہ کوششوں کی حمایت کرتے ہیں کہ وہ غزہ کی جنگ ختم کریں اور مشرقِ وسطیٰ میں پائیدار امن لائیں۔
- ہم اس معاہدے کو اس طرح نافذ کریں گے کہ وہ امن‘ سلامتی‘ استحکام اور مواقع کی ضمانت دے‘ نہ صرف فلسطینیوں بلکہ اسرائیلی باشندوں کے لیے بھی۔
- ہم اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس خطے کی مذہبی اہمیت ہے‘ اور مقدس مقامات کا احترام اور حفاظت امن معاہدے کا حصہ ہوں گے۔
- ہم تشدد‘ انتہا پسندی اور نسل پرستی کے خلاف متحد ہیں‘ اور اختلافات کو مذاکرات اور سفارتی راستے سے حل کرنے کا عہد کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ غزہ امن منصوبہ بظاہر چار بڑے ستونوں یعنی (۱) سفارت کاری‘ (۲) انسانی امداد و تعمیرِ نو‘ (۳) عوامی و فکری کردار‘ (۴) علاقائی تعاون و سلامتی پر مبنی ہے‘ مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جس وقت شرم الشیخ میں یہ معاہدہ ہو رہا تھا تو پاکستان کے مختلف شہروں میں اہلِ غزہ سے اظہارِ یکجہتی کے نام پر شروع ہونے والے مظاہرے‘ مظاہرین اور

انتظامیہ کے خون سے رنگین ہو رہے تھے۔ مظاہروں کو خون سے رنگین کرنے کی اصل ذمہ داری کا تعین کرنے کے لیے ایک الگ اور تفصیلی مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ البتہ اظہارِ یکجہتی کے لیے یہ خاص وقت ضرور قابلِ غور ہے اور اسی خاص وقت میں پڑوسی مسلم ملک کے ساتھ سرحدوں پر گولہ باری کی خبروں کو ''محض اتفاق'' خیال کرنا مشکل کام ہے' کیونکہ ماضی میں بھی اہلِ پاکستان یہ منظر دیکھ چکے ہیں کہ اسلام' دین اور ناموسِ رسالت ﷺ جیسے ایشوز پر اُن کے جذبات کا ناجائز فائدہ اُٹھایا جا چکا ہے۔ عوام کا خون خواص کے خون سے شاید زیادہ سرخ ہوتا ہے جس کا گرایا جانا خاص مواقع پر زیادہ ''اچھا'' تاثر دیتا ہے۔ بہرحال ہم واپس غزہ امن معاہدے کی طرف لوٹتے ہیں۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنے بیس نکاتی منصوبے کے ذریعے غزہ میں امن کے قیام کی بات کی ہے۔ وہی ٹرمپ جس نے اپنے سابقہ دورِ حکومت میں بھی کھل کر اسرائیل کا ساتھ دیا' ابراہم اکارڈ اور ڈیل آف دی سنچری کے نام پر مسلم حکمرانوں سے اسرائیل کو تسلیم کروایا' یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کیا' اسی ٹرمپ کے ساتھ مسلم حکمران دوبارہ کھڑے نظر آتے ہیں' خوش ہو کر اس کے ساتھ تصویریں بنواتے ہیں۔ ابراہم اکارڈ ۲ کی باتیں بڑے خوش نما انداز میں ہوئیں۔ بعض مسلم حکمرانوں نے ٹرمپ کو ''امن کا علمبردار'' بھی قرار دے دیا اور نوبل انعام کے لیے بھی نامزد کر دیا' حتیٰ کہ شرم الشیخ میں بھی پاکستانی وزیراعظم نے ایک مرتبہ پھر ٹرمپ کو امن کے نوبل انعام کے لیے نامزد کر دیا۔ کون ہے جو یہ بات بھول چکا ہوگا کہ یہ وہی ٹرمپ ہے جو اسرائیل کو فلسطینیوں کی نسل کشی کے لیے اسلحہ اور امداد فراہم کرتا رہا اور جنگ بندی کی ہر قرارداد کو ویٹو کرتا رہا ہے۔ ٹرمپ کے پیش کردہ ۲۰ نکاتی فارمولا میں بھی اسرائیلی مفادات کا تحفظ کیا گیا ہے کہ حماس کو کسی نہ کسی طرح سے ختم کیا جائے' فلسطینیوں کو اسلحہ سے پاک کیا جائے۔ ایک ایسی لولی لنگڑی فلسطینی ریاست کی بات کی جا رہی ہے جس کی نہ اپنی فوج ہوگی' نہ اپنی پولیس ہوگی' نہ اپنے دفاع کا انتظام ہوگا۔ کیا محمود عباس کی نام نہاد فلسطینی اتھارٹی پہلے سے موجود نہیں؟ کیا وہ فلسطینیوں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ کر سکی ہے؟ قائداعظم نے کہا تھا کہ اسرائیل مغرب کا ناجائز بچہ ہے اور اس کو تسلیم کرنے کا مطلب ظلم اور جبر کی تائید کرنا ہے۔ دو ریاستی فارمولے کو تسلیم کرنے کا سادہ سا مطلب اسرائیل کی ریاست کو تسلیم کرنا ہے۔ بعض

حلقوں کا خیال ہے کہ امریکی صدر ٹرمپ کی ثالثی دو بلیوں کی کیک پر لڑائی میں بندر کی ثالثی جیسی ہی ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ٹرمپ اس معاملے میں غیر جانبدار نہیں ہیں۔ وہ اسرائیل کے دیرینہ حلیف اور کئی مواقع پر خود اس جنگ کے فریق رہے ہیں۔ ایران پر حملوں میں اُن کی براہِ راست مداخلت اور اسرائیلی موقف کی غیر مشروط حمایت اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اُن کا منصوبہ فلسطینیوں کے حق میں نہیں بلکہ اسرائیلی مفادات کے تحفظ کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ جب ایک فریق بھاری اسلحہ اور غیر اعلانیہ ایٹمی طاقت رکھتا ہو اور دوسرے سے غیر مسلح ہونے کا مطالبہ کیا جائے تو یہ انصاف نہیں بلکہ جبر کی انتہا ہے۔ ایسی ثالثی امن کو نہیں' استحصال کو فروغ دیتی ہے۔

۷ اکتوبر ۲۰۲۳ء کی حماس کی کارروائی کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ کچھ عرب ممالک اسرائیل کو تسلیم کرنے سے پیچھے ہٹ گئے' ورنہ سعودی عرب سمیت تمام عرب ممالک اور اکثر غیر عرب مسلم ممالک بھی ڈونلڈ ٹرمپ کے جال میں پھنس کر اسرائیل کو تسلیم کرنے والے تھے۔ آج ٹرمپ نے دوبارہ وہی جال پھینکا ہے اور مسلم حکمران اِس جال میں پھنسے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہمارے حکمران اور مقتدر ادارے بھی قائداعظم کی پالیسی کی مخالفت کرتے ہوئے دو ریاستی حل کی بات کر رہے ہیں' حالانکہ پاکستان کی شروع دن سے یہ پالیسی تھی کہ اسرائیل کو کسی صورت تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ترکیہ کے صدر رجب طیب اردوان نے شرم الشیخ میں منعقدہ تقریب میں محض اس لیے شرکت نہیں کی کہ وہاں اسرائیلی وزیراعظم بھی موجود ہوں گے حالانکہ ترکیہ اور اسرائیل میں روابط کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں' جبکہ ہمارے وزیراعظم صاحب قائداعظم کی دی ہوئی پالیسی کو روند کر صدر ٹرمپ کو امن کے نوبل انعام کے لیے نامزد کرنے کے لیے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ صحیح تر الفاظ میں بھاری بوٹوں نے اُنہیں وہاں پہنچایا تھا۔

کہا جا رہا ہے کہ شرم الشیخ میں جاری کیے گئے اعلامیہ کے نتیجے میں اگر ایک فلسطینی ریاست قائم ہو جاتی ہے' (جو کہ پہلے سے موجود بھی ہے) اور اسرائیل اسے تسلیم کر بھی لیتا ہے تو فلسطینیوں کی اندرونی لڑائی ختم نہیں ہو سکتی۔ ستمبر ۲۰۲۵ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں جو دو ریاستی قرارداد منظور ہوئی تھی' اُس کے بارے میں بظاہر تو یہی کہا جا رہا ہے کہ یہ قرارداد آزاد فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے کا اعلان ہے مگر اس خطے کی سیاست پر گہری نظر رکھنے والوں کا خیال ہے کہ یہ دراصل ایک آزاد اور خودمختار فلسطینی ریاست نہیں بلکہ ایسی ریاست ہے جس پر پی ایل او کا

کنٹرول ہوگا اور پی ایل او کس کے کنٹرول میں ہے‘ یہ حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

امن فارمولا کے نام پر ٹونی بلیئر کو عبوری سیٹ اپ کا سربراہ بنانے کی تجویز دی گئی ہے جس کے ہاتھ عراق اور فلسطین کے مسلمانوں کے خون سے پہلے ہی رنگے ہوئے ہیں۔

اِن حالات میں مسلم حکمرانوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مسلم ممالک کا اپنا اتحاد ناگزیر ہو چکا ہے۔ اگر غیر مسلم قوتیں نیٹو کے نام سے اکٹھی ہو سکتی ہیں تو مسلم ممالک مشترکہ عسکری اتحاد کیوں نہیں بنا سکتے؟ اگر آج بھی مسلم ممالک کھڑے نہیں ہوں گے تو کیا ٹرمپ‘ ٹونی بلیئر یا نتن یاہو پر بھروسا کر کے محفوظ رہ سکتے ہیں؟ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ ان پر بھروسا کر کے اور اُن کی جھوٹی سچی تعریفیں کر کے ان کے اپنے اقتدار محفوظ رہ سکتے ہیں تو یہ اُن کی بہت بڑی بھول ہے۔

دنیا کو مشرقِ وسطیٰ میں اگر واقعی پائیدار امن چاہیے تو یہ ناجائز صہیونی ریاست اسرائیل کے خاتمے کے بغیر ممکن نہیں۔ اِس وقت ضرورت اِس امر کی ہے کہ دنیا انصاف کے ترازو کو ایک طرف جھکنے سے روکے۔ فلسطینی عوام کو اُن کا حقِ خودارادیت دیا جائے اور اسرائیل کو سمندر بدر کر دیا جائے۔

تادمِ تحریر اسرائیلی جارحیت عارضی طور پر بند ہو چکی ہے اور اہلِ غزہ کے لیے امدادی راستے کھولے جا چکے ہیں۔ البتہ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ جب یہ سطور شائع ہو کر قارئین تک پہنچیں‘ ماضی کے جنگ بندی کے معاہدے کی طرح خدانخواستہ بات پھر وہیں سے شروع ہو چکی ہو جہاں رُکی تھی۔ ہم نے ہنری کسنجر کی کہی ہوئی بات کو کبھی غلط ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اُس نے کہا تھا: ’’امریکہ سے اُس کے دشمنوں کو اتنا خطرہ نہیں ہوتا جتنا اُس کے دوستوں کو ہوتا ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھ اور ہدایت عطا کرے۔ آمین!

❁❁❁

قارئین کرام نوٹ فرمالیں کہ 164 صفحات پر مشتمل ’’میثاق‘‘ کی یہ خصوصی اشاعت ماہ نومبر اور دسمبر کے دو شماروں پر محیط ہے۔ (ادارہ)

عظمتِ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تعارفی پس منظر (از سید نسیم الدین☆)

میں سید نسیم الدین‘ جو بظاہر صرف نام کا ایک مسلمان‘ نمازِ جمعہ کی ادائیگی ہی کو اپنی دینی وابستگی سمجھتا تھا۔ میرا دفتر ابوظبی شہر کے مضافات میں تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا۔ روزانہ طویل ڈرائیونگ کے دوران عام طور پر گانے اور غزلیں سننا ایک معمول تھا۔

کسی تقریب سے واپسی میں ایک صاحب نے (نام مجھے یاد نہیں‘ جس کا شدید قلق آج تک ہے) آڈیو کیسٹ رکھ دی۔ بے خیالی میں آفس جاتے ہوئے وہی کیسٹ چلا دی اور جیسے ہی تلاوتِ قرآن کی آواز کانوں سے ٹکرائی‘ خیال آیا کہ بند کر دوں‘ لیکن بہرحال مسلمان تھا‘ تو سوچا کہ تلاوت ختم ہو جائے پھر بند کر دوں گا۔ تلاوت کے بعد سوچا کہ تھوڑا سا سن لیتا ہوں کہ یہ مولوی صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ جیسے جیسے سنتا گیا‘ دل کی دنیا بدلتی گئی۔ یہ کیسٹ سورۃ العصر کے درس پر مشتمل تھی‘ جو کینیڈا کے رفقاء تنظیم کے سامنے بیان کیا گیا تھا۔ مقرر کوئی عام شخص نہیں بلکہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ تھے‘ جن کے نام کا علم مجھے بعد میں ہوا۔

یہ لمحہ میری زندگی کا نقطۂ انقلاب ثابت ہوا۔ خیال ہوا کہ جس شخص کی کیسٹ سن کر میرے اوپر اتنا گہرا اثر ہوا ہے وہ میرے سامنے بیان کرے تو میرے کیا احساسات ہوں گے! چنانچہ میں نے کیسٹ پر دیے گئے پتے پر خط لکھا۔ جواب میں جناب چودھری غلام محمد مرحوم و مغفور کا خط ملا جس میں مجھے ڈاکٹر صاحب کی کتب کے مطالعہ کی ترغیب دی گئی تھی۔ میں نے بھی جواباً خط لکھ کر تمام کتب منگوالیں۔ خطوط کا یہ تبادلہ کچھ عرصہ رہا لیکن بانیٔ محترم رحمہ اللہ کے ابوظبی آنے

☆ مرکزی معاون برائے شعبہ تحقیق و تجزیہ‘ تنظیم اسلامی

کے متعلق کوئی واضح بات کوشش کے باوجود سامنے نہیں آئی۔ بعد ازاں مجھے بتایا گیا کہ ڈاکٹر صاحب ہر ماہ کراچی درسِ قرآن کے لیے تشریف لے جاتے ہیں‘ اگر آپ کراچی میں ہوں تو ملاقات ہوجائے گی اور رابطہ کے لیے ایک ٹیلیفون نمبر بھی دیا گیا۔ میں نے بھی ابوظبی سے کراچی کا رختِ سفر طے کیا اور ڈاکٹر صاحب کے آنے سے چند دن پہلے ہی کراچی آ پہنچا۔ کچھ گھریلو کام سے برنس روڈ کی طرف گیا تو وہاں ایک دکان پر جس میں بجلی کا سامان ملتا تھا‘ لکھا دیکھا کہ ’’یہاں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کتب اور کیسٹ دستیاب ہیں۔‘‘ دکان کے اندر گیا تو جناب عبدالواحد عاصم مرحوم ومغفور سے ملاقات ہوئی۔ ان سے سارا ماجرا کہہ سنایا تو انہوں نے ٹیلیفون نمبر کے متعلق دریافت کیا۔ نمبر دیکھتے ہی انہوں نے کہا کہ آپ کو رابطہ کے لیے جو نمبر دیا گیا ہے وہ میرا ہی ہے۔

شومئ قسمت کہ صحت کی خرابی کے باعث ڈاکٹر صاحب اس ماہ کراچی تشریف نہ لا سکے۔ میں بھائی عبدالواحد عاصم کے پاس دوبارہ حاضر ہوا تو انہوں نے وہاں تشریف فرما ایک اور صاحب شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم ومغفور سے ملاقات کروادی۔ شیخ جمیل الرحمٰن نے اسی وقت تقریباً پون گھنٹہ انٹرویو کے دوران میری ذاتی‘ خانگی‘ معاشرتی ومعاشی حالات سے واقفیت کے بعد تسلی دی کہ آپ انتظامات کریں‘ ڈاکٹر صاحب‘ ان شاء اللہ‘ ابوظبی تشریف لائیں گے جن کے ہمراہ مَیں اور قمر سعید قریشی صاحب بھی ہوں گے۔

میں اس وقت ابوظبی میں پاکستان کلچرل سینٹر کا اعزازی جنرل سیکرٹری تھا۔ یہاں پاکستان کے مختلف ثقافتی طائفے‘ علمی وادبی شخصیات کی آمد ہوتی تھی‘ جو بعد ازاں شارجہ‘ دبئی اور متحدہ عرب امارات کے مختلف شہروں میں بھی جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں آیا کہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے خطابات دس دن تسلسل سے پاکستان کلچرل سینٹر‘ ابوظبی ہی میں رکھے جائیں تاکہ سامعین کے سامنے ڈاکٹر صاحبؒ کا مکمل فکر آ سکے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اس کی منظوری بھی دے دی۔ ابوظبی میں اشتہار یا بینر لگانا ممنوع تھا‘ اس لیے کلچرل سینٹر کے ذریعے ممبران کو اس پروگرام کے خطوط لکھ دیے گئے۔ اس کے علاوہ تشہیر کا دوسرا ذریعہ صرف ٹیلیفون تھا۔ بطور جنرل سیکریٹری میرا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع تھا‘ تو میں نے ان سب حضرات وخواتین کو فرداً فرداً ٹیلیفون بھی کر دیا۔

دسمبر ۱۹۸۵ء میں مرد حضرات کے لیے ہال میں اور خواتین کے لیے ہال کے اوپر والے حصہ میں شرکت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پروگرام دس دن پر مشتمل تھا۔ جمعرات کے دن سے اس کا آغاز ہوا۔ جمعہ کے روز امارات میں چھٹی ہوتی ہے۔ پہلے ہی دن تقریباً ایک ہزار کی گنجائش والا ہال تنگیٔ داماں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے خطاب شروع کرنے سے قبل سامعین سے ارشاد فرمایا ’’کل چونکہ چھٹی کا دن ہے اس وجہ سے آپ لوگ آج زیادہ آ گئے۔‘‘ احتیاطاً دوسرے دن کے لیے ہال کے دونوں طرف کے برآمدوں میں بھی ٹیلی ویژن کا اہتمام کر دیا گیا‘ لیکن لوگوں کی حاضری میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ اس لیے میدان میں بھی انتظام کرنا پڑا۔ حاضرین کی اتنی بڑی تعداد پاکستان کلچرل سینٹر میں پہلے کسی موقع پر نہیں ہوئی تھی۔

اسی موقع پر ایک بہت اچھے دوست وقار صاحب نے اپنے ذاتی کیمرے سے پروگرام ریکارڈ کیا۔ یہی ریکارڈنگ اس دور میں تنظیم اسلامی کی پہلی کوالٹی ویڈیو ریکارڈنگ قرار پائی۔ اس وقت ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ ریکارڈنگ دعوتی حوالے سے کتنی مؤثر ثابت ہوگی!

ادارہ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے مقررین کی میزبانی میری ذمہ داری تھی۔ اس لیے نوروزہ پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر صاحبؒ کی خواہش پر ابوظبی میں موجود تنظیم کے پرانے رفیق سرفراز چیمہ صاحب (جو الحمدللہ حیات ہیں) کے ڈیرے پر ڈاکٹر صاحبؒ اور ان کے ہمراہیوں کو لے کر جانا ہوا۔ احباب نے ڈاکٹر صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی (طویل وقت گزر جانے اور یادداشت کے ساتھ نہ دینے کے باعث کوئی اندازہ بھی نہیں ہے کہ یہ کتنے احباب تھے) اور ڈاکٹر صاحب نے وہاں پرانے (جن کی تعداد پانچ تھی) اور نئے رفقاء سے خطاب بھی کیا۔ اگلے دن ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا: نسیم الدین صاحب! میں نے جو کچھ نو راتوں میں بیان کیا‘ آپ کو سمجھ میں آیا ہے؟‘‘ میں نے جواب دیا: ’’جی ہاں!‘‘ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: ’’تو پھر آپ نے بیعت کیوں نہیں کی؟‘‘ میں نے چند لمحوں کے تامل کے بعد کچھ باتیں کہیں جو مجھے اب یاد نہیں ہیں‘ البتہ ان ہی میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ میں اس حوالہ سے کچھ اور لوگوں کو بھی پڑھنا اور سننا چاہتا ہوں لیکن بیعت کرنے کے بعد نہ انہیں پڑھ سکوں گا اور نہ سن سکوں گا۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ تو آپ بیعت کرنے کے بعد بھی پڑھ سکتے ہیں‘ سمجھ سکتے ہیں۔ بیعت کرنے کے بعد کسی اور کو سننا یا پڑھنا ممنوع نہیں ہے۔ چند لمحوں کے

تامل کے بعد الحمدللہ مجھے انشراح حاصل ہوا اور میں نے بھی بیعت کی سعادت حاصل کر لی۔ یوں اللہ تعالیٰ نے میرے لیے دین کے صحیح تصور اور مقصدِ زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک نیا باب کھول دیا۔

اسی دورے میں ڈاکٹر صاحبؒ کا ایک خطاب دوستوں کی مدد سے ابوظبی ریڈیو پر بھی نشر ہوا۔ ابوظبی ریڈیو انتظامیہ نے پروگرام کی مد میں کچھ رقم پیش کی' جسے ڈاکٹر صاحبؒ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب ریڈیو کی انتظامیہ نے بھی رقم واپس لینے سے انکار کیا تو ڈاکٹر صاحبؒ نے میرے ہی ذمہ یہ کام لگایا کہ ''یہ رقم دین کے کام میں لگائی جائے۔''

ڈاکٹر صاحبؒ کے اس نو روزہ پروگرام کے بعد ہی پہلے ابوظبی میں اور بعد ازاں دیگر شہروں دبئی' شارجہ' العین وغیرہ میں دروسِ قرآن کی محافل ہفت روزہ/ماہانہ بنیادوں پر قائم ہوئی تھیں۔ راقم کی رہائش گاہ پر بھی خواتین کے لیے ہفت روزہ بنیادوں پر حلقہ قرآنی قائم ہو گیا۔ واقعی' یہ تمام سلسلہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت کے بغیر ممکن نہ تھا۔

آج بھی اُس دور کی ویڈیوز کے ذریعے دین کا جامع تصور واضح طور پر دنیا کے سامنے آ رہا ہے۔ ابوظبی میں ہونے والی یہ ویڈیو ریکارڈنگز تنظیم اسلامی کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ پہلی ویڈیوز تھیں جن کے ذریعے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے افکار و پیغامِ قرآن کو عالمی سطح پر پہنچنے کا موقع ملا۔ ان بیانات میں دین اسلام کا جامع اور انقلابی تصور نہایت واضح انداز میں پیش کیا گیا' جس نے ہزاروں افراد کے فکر و عمل پر اثر ڈالا۔ ان ویڈیوز نے تنظیم کی دعوتی و فکری شناخت کو مضبوط کیا' نئے رفقاء کے لیے تربیت کا مؤثر ذریعہ فراہم کیا' اور آئندہ نسلوں کے لیے استقامت' اخلاص اور حکمتِ دعوت کا عملی نمونہ چھوڑا۔ آج بھی یہ ریکارڈنگز قرآن حکیم کے پیغام کو سمجھنے اور دین کے تصور کو اجاگر کرنے میں بے حد نافع ہیں۔

الحمدللہ' ایک آڈیو کیسٹ کے ذریعے میری زندگی میں جو تبدیلی واقع ہوئی' دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس پر استقامت عطا فرمائے اور اس تبدیلی میں جن جن لوگوں کا حصہ رہا' اللہ سبحانہ وتعالیٰ انہیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ بالخصوص بانی محترم رحمہ اللہ جن کی غیر معمولی شخصیت نے اپنے بیان اور عمل کے ذریعے مجھے اس دنیا کی حقیقت سے آشنا کیا اور حقیقی مقصدِ زندگی کی طرف مائل کیا۔ ❁❁❁

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

فقال اللہ تبارک و تعالیٰ فی سورۃ الرحمٰن:

﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ۝۴﴾

وقال اللہ تبارک و تعالیٰ فی سورۃ یونس:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۵۷ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۝۵۸﴾

وقال اللہ تعالیٰ فی سورۃ الحشر:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱﴾

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمِ

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:

((خَیْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهُ)) (متفق علیہ)

عن عمر بن الخطاب ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ :

((اِنَّ اللّٰهَ یَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِهٖ آخَرِیْنَ))(صحیح مسلم)

وَعَنْ عَلِیٍّ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ :

((اِنَّهَا سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ)) قُلْتُ: مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ؟ قَالَ: كِتَابُ اللّٰهِ، فِیْهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ، وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ، وَحُكْمُ مَا بَیْنَكُمْ ..... مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ، وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ، وَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ، وَمَنْ دَعَا اِلَیْهِ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ))

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ

آج کی گفتگو نورِوزہ سلسلہ وار پروگرام کے لیے بطورِ تمہید ہے۔ ہمیں ان شاء اللہ ایک منطقی ترتیب کے ساتھ قرآن مجید کے چند مقامات کا مطالعہ کرنا ہے۔ لہٰذا آج کا موضوع ''عظمتِ قرآن'' رکھا گیا ہے۔ اس کے ضمن میں قرآن مجید کے کچھ پہلو تو وہ ہیں جن کا اقرار و اعتراف غیر مسلموں کو بھی ہے لیکن ساتھ ہی کچھ پہلو ایسے ہیں جن کا ادراک و شعور صرف صاحبِ ایمان ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ آج کی گفتگو کا آغاز اُن نکات سے کیا جائے گا جن کا اعتراف غیر مسلموں نے ڈنکے کی چوٹ پر کیا۔

اصل متن کی حفاظت

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جتنی بھی کتابوں کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ آسمانی یا الہامی ہیں یا جتنی کتابوں نے خود دعویٰ کیا ہے کہ وہ اس کائنات کے خالق کے کلام پر مشتمل ہیں' ان میں سے صرف ایک یعنی قرآن مجید ہی ایسی کتاب ہے جس کی حجیت (integrity) اور حقانیت (authenticity) پر آج تک قطعاً کوئی حرف نہیں رکھا جا سکا۔ باقی کوئی کتاب اپنے اصل متن (text) کے ساتھ آج محفوظ نہیں۔ مثلاً تورات کے بارے میں قرآن مجید تصدیق کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب تھی:

﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ ۚ﴾ (المائدۃ:۴۴)

''بے شک ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور تھا۔''

لیکن اس کے ماننے والے خود تسلیم کرتے ہیں کہ تورات کا اصل نسخہ پوری دنیا میں آج کہیں بھی موجود نہیں۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں جب یروشلم تباہ و برباد ہو گیا تھا' اُس کے بعد سے یہود تقریباً ۱۵۰ برس تک جلا وطنی کے عالَم میں رہے۔ پھر جب وہ بابل سے واپس آئے تو اُن میں سے کچھ لوگوں نے اپنی یادداشت سے تورات کو مرتّب کیا۔ گویا یہ بات تورات کے ماننے والے خود تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے احکامِ عشرہ (Ten Commandments) جو پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے دیے گئے تھے' اُن کا آج دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے۔

اسی طرح کا معاملہ انجیل کا ہے۔ قرآن مجید تسلیم کرتا ہے کہ انجیل بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب تھی:

﴿وَاٰتَيۡنٰهُ الۡاِنۡجِيۡلَ فِيۡهِ هُدًى وَّنُوۡرٌ﴾ (المائدۃ:۴۶)

''اور ہم نے اُسے انجیل عطا کی جس میں ہدایت اور نور تھا۔''

لیکن وہ اصل انجیل آج دنیا میں کہیں نہیں ہے بلکہ چار اناجیل پائی جاتی ہیں۔ میں نے زمانہ طالب علمی میں جب ایک پادری صاحب سے سوال کیا: ان چار میں سے بائبل کون سی ہے؟ تو انہوں نے انتہائی ذہانت سے جواب دیا: ان میں سے کوئی بائبل نہیں لیکن بائبل ان میں ہے۔ بہرحال یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان یا تو عبرانی تھی یا آرمینائی لیکن آج دنیا میں ان دونوں زبانوں میں انجیل کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ جو سب سے قدیم نسخہ ہے' وہ بھی یونانی ترجمہ ہے لیکن ترجمہ کبھی اصل ہو ہی نہیں سکتا' کیونکہ کسی بھی کتاب کو کسی دوسری زبان میں جوں کا توں منتقل کرنا ممکن ہی نہیں۔ اسی وجہ سے برصغیر پاک و ہند میں علماء کرام ایک طویل عرصہ تک قرآن مجید کے ترجمہ کرنے کی مخالفت کرتے رہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی توجہ تراجم کی طرف ہو جائے اور اصل متن کی طرف سے ہٹ جائے۔ لہٰذا جب پہلی مرتبہ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تو بعض علماء نے اُن کے خلاف باقاعدہ شورش برپا کی کہ اُن کو قرآن مجید کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

بہرحال ان دونوں کتابوں کے بارے میں ان کے اپنے ماننے والے اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اصل کتاب اب کہیں نہیں ہے جبکہ دُنیا میں سب نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن مجید واحد کتاب ہے جو حضرت محمد ﷺ نے اپنی اُمت کو عطا کی ہے' چاہے وہ یہ نہ مانیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' یعنی ''اللہ تعالیٰ نے اسے محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا' کیونکہ اس صورت میں تو وہ مسلمان کہلائیں گے۔ بے شمار مستشرقین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ قرآن حکیم کا متن (text) محفوظ ہے۔ اس کی integrity اور authenticity کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں' یہاں تک کہ اگر اس کی

قراءت (mode of recitation) میں بھی ذرا سا فرق ہے تو اسے بھی محفوظ رکھا گیا۔ آج بھی سبعہ قراءت اور عشرہ قراءت کے قاری ملتے ہیں جو کہ اپنی جگہ پر ایک فن ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو شخص اسے جیسے چاہے پڑھ لے' بلکہ اس کا ایک ایک شوشہ محفوظ کر لیا گیا ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی حفاظت کا ذریعہ اس کا حفظ' اس کا لوگوں کے سینوں میں جمع ہو جانا ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾﴾ (القیمۃ)

''(اے نبی ﷺ!) اس قرآن کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت مت دیا کریں۔ بے شک ہمارے ذمہ ہے اس قرآن کو جمع کر دینا اور اس کو پڑھوا دینا۔ پھر جب ہم قرآن کو پڑھا کریں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کیا کریں۔ پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی وضاحت بھی۔''

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے ذہن میں ایک مغالطہ ہے اور اس کی وجہ سے دشمنوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ہماری مسجدوں میں جمعہ کے خطبات میں قافیہ ملانے کی کوشش میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ ''جامِعُ آیاتِ القُرآن'' کہا جاتا ہے۔ اس طرح کسی کو کہنے کا موقع مل سکتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں آ کر قرآن مجید کو جمع کرنے کا کام ہوا' حالانکہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اصل میں انہوں نے تو ایک کتابت شدہ نسخہ پر اُمّت کو جمع کیا تھا۔ جمع قرآن کا کام تو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لیا۔ یہ کام اللہ تعالیٰ نے کسی صحابیؓ یا رسول اللہ ﷺ پر بھی نہیں چھوڑا بلکہ خود اس کو حضرت محمد ﷺ کے سینہ میں محفوظ فرمایا۔ حضورؐ ہر رمضان المبارک میں حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دور فرماتے تھے جبکہ اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری رمضان المبارک میں حضرت جبریلؑ کے ساتھ دو مرتبہ پورے قرآن مجید کا دور کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید اُسی وقت جمع ہو کر مرتب ہو چکا تھا۔ البتہ اولاً قرآن مجید حضور ﷺ کے سینہ میں جمع کیا گیا' پھر یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے

سینوں میں جمع ہوا۔ اُس وقت کاغذ بہت نایاب تھا' اس لیے حضور ﷺ کے انتقال کے وقت قرآن مجید کتابی شکل میں (مَا بَيْنَ الدُّفَّتَيْنِ) تو نہیں تھا لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس کچھ کتابت شدہ اوراق موجود تھے۔ کسی کے پاس اونٹ کے شانہ کی ہڈی پر' کسی کے پاس جھلی پر اور دوسری چیزوں پر لکھا ہوا موجود تھا۔ پھر حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کے دور ہی میں قرآن مجید کو کتابی صورت میں جمع کر دیا گیا تھا۔ جب جنگ یمامہ میں بہت سارے حُفّاظ شہید ہو گئے تو تشویش پیدا ہوئی کہ قرآن مجید کی حفاظت کیسے ہوگی! تب حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے مشورہ سے ایک بورڈ مقرر کیا جس میں اُن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا جو حضور ﷺ کے زمانہ میں کتابتِ وحی کی ذمہ داری انجام دیتے تھے اور پھر اُن سب نے قرآن مجید کو کتابی شکل میں جمع کر دیا۔

ہر بڑی زبان کی طرح عربی زبان میں بھی کچھ بولیاں (colloquials) رائج تھیں' جن کے حوالہ سے حضور ﷺ نے رعایت دی تھی کہ لوگ مختلف لہجوں میں قرآن مجید پڑھتے تھے۔ البتہ اس سے یہ اندیشہ ہوا کہ قرآن مجید کے بارے میں اختلاف نہ ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک مصدقہ (authentic) نسخہ کتابی شکل میں تیار کیا تاکہ اس کے بعد دنیا میں صرف یہی رہے۔ باقی سارے نسخوں کو تلف کر دیا گیا تاکہ لہجے کا کوئی اختلاف بھی باقی نہ رہے۔ اس اصل نسخہ کی جو چار نقول (copies) تیار کی گئیں' وہ آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک نسخہ وہ ہے جس سے حضرت عثمانؓ اپنی شہادت کے وقت تلاوت فرما رہے تھے اور اس پر اُن کے خون کے دھبے موجود ہیں۔ اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں کو ایک کتابت شدہ نسخہ پر جمع کر دیا گیا۔ آج اُمّتِ مُسلمہ میں حفاظتِ قرآن کے عمل میں بہت بڑے پیمانہ پر حفاظ حصہ لے رہے ہیں۔ دنیا میں کوئی اور کتاب ایسی نہیں جس کے لاکھوں حُفّاظ موجود ہوں۔ بعض ممالک میں آٹھ' دس سال کے حافظ بچے بڑوں کی تصحیح کر دیتے ہیں۔ اس طرح قرآن مجید کا ایک ایک شوشہ محفوظ کر لیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی عظمت وفضیلت کے ضمن میں یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جن کتابوں

کو بھی آسمانی ہونے کا دعویٰ ہے‘ ان میں قرآن مجید واحد کتاب ہے جس کا متن محفوظ ہے۔ دنیا میں کوئی اور کتاب ایسی نہیں جو یہ دعویٰ کر کے قرآن مجید کے مقابلہ میں آسکے۔ اس حقیقت کے ادراک وشعور کے لیے قرآن مجید پر ایمان لازم نہیں‘ بلکہ اس کا اعتراف ہر شخص کرنے پر مجبور ہے خواہ وہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام مانتا ہو یا نہ مانتا ہو۔

انقلاب کا آلہ

قرآن مجید کی عظمت کے ضمن میں دوسری بات جو کہ پوری دنیا کو ماننی پڑے گی اور اصحابِ دانش وبینش مانتے بھی ہیں کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا تعلق کسی زمانہ قبل از تاریخ (pre-historic era) سے نہیں۔ حضور ﷺ کی شخصیت کا ظہور صرف ۱۴۰۰ برس قبل ہوا جبکہ تاریخ کا نصف النہار (the very mid-day of history) تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ کی شخصیت کا کوئی پہلو بھی پردۂ اخفا میں نہیں۔ ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہے کہ آپ ﷺ نے تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا۔

موجودہ دور میں مشاہیر عالم کے موضوع پر امریکہ میں ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے ایک منفرد (unique) کتاب ''The Hundred'' تصنیف کی جس میں پوری انسانی تاریخ کی ۱۰۰ عظیم ترین شخصیات کا انتخاب کیا گیا اور پھر ان کی درجہ بندی قائم کی گئی۔ یہ ترتیب تاریخی اعتبار سے نہیں بلکہ اس لحاظ سے کی گئی کہ ان میں عظیم ترین انسان کون ہے! اُس نے نمبر ایک پر جس شخصیت کو رکھا‘ وہ ہیں حضرت محمد ﷺ۔ اُس نے کہا کہ لوگ میری تصنیف میں محمد (ﷺ) کا ذکر پہلے نمبر پر دیکھ کر حیران ہوں گے (اس لیے کہ وہ خود عیسائی ہے)‘ چنانچہ اس نے وضاحت یوں پیش کی:

"He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

''(محمد ﷺ) تاریخ میں نسلِ انسانی کی وہ واحد شخصیت ہیں جو مذہبی اور سیکولر دونوں سطح پر پوری طرح انتہائی کامیاب ہیں۔''

دراصل آج کے انسان نے زندگی کے دو خانے اپنے ذہن میں قائم کر لیے ہیں۔

ایک کو وہ مذہبی خانہ کہتا ہے جسے انفرادی زندگی سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً عقائد‘ عبادات‘ خوشی غمی کے مواقع کی رسومات (پیدائش‘ فوتیدگی وغیرہ)۔ دوسرا خانہ سیکولر سمجھا جاتا ہے جو سیاست‘ معیشت‘ تمدن‘ قانون‘ عدالت وغیرہ سے متعلق ہے۔ اس میں اُن کے خیال میں کسی مذہب کی بات نہیں ہونی چاہیے بلکہ جو بھی اُس ملک کے رہنے والوں کی اکثریت کی رائے ہو‘ اُسی کے مطابق فیصلے ہونے چاہئیں۔ اسلام کے نزدیک انسانی زندگی ناقابلِ تقسیم وحدت ہے‘ ایک حیاتیاتی اکائی (organic whole) ہے جس کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ جدید ذہن رکھنے کے باوجود مائیکل ہارٹ نے جو سب سے بڑی تحسین (tribute) ہو سکتی ہے‘ وہ حضور ﷺ کو پیش کر دی۔ اُس نے کہا کہ پوری انسانی تاریخ میں ان دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب انسان صرف ایک ہیں اور وہ ہیں محمد (ﷺ)‘ بلکہ ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ اُن کی زیادہ عظمت مذہبی میدان میں ہے یا سیکولر میدان میں۔ دُنیا میں اور جو بھی عظیم شخصیات نظر آئی ہیں‘ وہ یک رُخی ہیں۔ یا اِس اعتبار سے عظیم یا اُس اعتبار سے۔ جو شخصیات دین میں‘ مذہب میں‘ روحانیت میں‘ اخلاقیات میں عظمت کی حامل ہیں جیسے حضرت مسیح علیہ السلام یا گوتم بدھ‘ ان کا سیاست میں کوئی دخل نہیں۔ وہ کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکے‘ کوئی نئی حکومت قائم نہیں کی۔ اس کے برعکس سکندر اعظم‘ چنگیز خان‘ ہٹلر ہیں جن کی فتوحات جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوئی ہیں‘ یعنی مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق تک‘ لیکن مذہب واخلاق کے میدان میں انہیں صرف صفر دینے سے بھی کام نہیں چلتا بلکہ کوئی minus value معین کرنی پڑتی ہے۔ یقیناً محمد عربی ﷺ ہی کی واحد شخصیت ہے جن کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی زیادہ عظمت مذہبی میدان میں ہے یا سیاسی وملکی میدان میں۔ ایک نئی تہذیب‘ نیا تمدن‘ نیا طرزِ حکومت‘ نیا نظامِ معیشت‘ نیا سماجی ومعاشرتی نظام‘ نیا قانون‘ غرض یہ کہ زندگی کے ہر اعتبار سے ایک انقلاب برپا کیا۔ یہ ہے محمد ﷺ کا وہ کارنامہ جس کو غیر مسلم بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

اس حوالہ سے ایک اور مثال ہندوستان کے ایک اہم اشتراکی کارکن ایم این رائے

(۱۸۸۷۔۱۹۵۴ء) کی ہے‘ جس نے اپنی کتاب "The Historical Role of Islam" میں تسلیم کیا ہے کہ تاریخ انسانی میں عظیم ترین انقلاب محمد ﷺ نے برپا کیا۔ آج کا موضوع اگرچہ سیرت النبی ﷺ کے حوالہ سے نہیں بلکہ عظمتِ قرآن ہے‘ البتہ جس بات کی جانب توجہ دلانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اس عظیم ترین انقلاب کے لیے حضور ﷺ کا آلۂ انقلاب قرآن مجید ہی تھا۔ ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اس قرآن کے ذریعہ لوگوں کے ذہن بدلے‘ سوچ بدلی‘ عقائد بدلے‘ نقطۂ نظر بدلا۔ اُن کا value structure تبدیل ہوگیا۔ پہلے زندگی عزیز ترین متاع شمار ہوتی تھی‘ اب موت سب سے بڑھ کر خوش آئند ہوگئی: ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت‘ نہ کشور کشائی

سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲﴾

’’(اے نبی ﷺ) آپ ان کافروں کی بات نہیں مانیے اور اس (قرآن) کے ذریعہ ان سے جہاد کیجیے۔‘‘

اصل میں حضرت محمد ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا‘ اس کا آغاز تو قرآن مجید سے ہوا لیکن اس کی تکمیل تلوار کے ذریعہ ہوئی۔ درحقیقت سب سے پہلے تبدیلی تو انسان کی سوچ میں‘ اس کے نقطۂ نظر میں آتی ہے۔ پھر انسان کے کردار و شخصیت میں‘ اُس کے شب و روز کے انداز میں انقلاب آتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے تو فرد واحد کی حیثیت میں دعوت کا آغاز فرمایا۔ ان کے پاس اصل تلوار قرآن مجید ہی کی تھی۔ اسی سے ذہنوں میں تبدیلی آئی‘ عقائد و نظریات بدلے‘ لوگوں کا تزکیہ ہوا اور اسی کو اُن کے اندر اُتارا۔ عظمتِ قرآن کے ذکر میں علامہ اقبال ایک فارسی شعر میں فرماتے ہیں:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

’’جب یہ قرآن کسی کے اندر اتر جاتا ہے تو اس کی شخصیت میں انقلاب آجاتا ہے۔ اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آجاتی ہے۔‘‘

پہلے وہ سمجھتا ہوگا کہ یہ کائنات خود بخود (by an accident) وجود میں آئی ہے۔ اندھا‘ بہرہ مادّہ اسے چلا رہا ہے۔ اب وہ سمجھتا ہے کہ ایک اللہ ہے جو عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ، اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ہے جس نے اس کائنات کو بنایا ہے اور اسے چلا رہا ہے۔ جو مدبر ہے: ﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ﴾ (السجدۃ:۵) پھر یہ کہ اس سے پہلے وہ حیاتِ دُنیوی کے بارے میں وہی سمجھتا ہوگا جو کہ آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر نے اس شعر میں کہا: ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے‘ دو انتظار میں!

یعنی کُل زندگی محض ۳۰‘ ۴۰‘ ۵۰‘ ۶۰‘ ۷۰ برس کی ہے۔ اس حوالہ سے قرآن مجید کے فلسفہ کی ترجمانی علامہ اقبال نے یوں فرمائی: ؎

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں‘ پیہم دواں‘ ہر دم جواں ہے زندگی!

زندگی ایک ابدی سلسلہ ہے‘ اس کا کوئی اختتام نہیں۔ جسے ہم موت کہتے ہیں‘ وہ The end نہیں۔ یہ زندگی کا ایک وقفہ ہے۔ انسانی سوچ و فکر کے اس انقلاب کے نتیجہ میں صحابہ کرامؓ کی ایک مخلص (dedicated) اور پُرعزم (committed) جماعت تیار ہوئی جو آخرت کے طالب تھے۔ اللہ کے عاشق‘ محمد ﷺ کے دیوانے‘ تن من دھن قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار تھے۔ آپ ﷺ کے چشم و ابرو کی جنبش اُن کے لیے حکم کے درجہ میں تھی جس کی وہ لازماً تعمیل کرتے تھے۔ اسی کے لیے انہوں نے اپنی گردنیں

کٹوا دیں‘ اپنے گھر اُجڑوا دیے‘ اپنا جو بھی دنیاوی اثاثہ تھا وہ قربان کر دیا‘ تب کہیں جا کر انقلاب آیا۔ یہ جو شخصیتیں تیار ہوئیں‘ ان کی تیاری کا ذریعہ قرآن مجید ہی تھا۔

نبی اکرم ﷺ کا اصل معجزہ

تاریخِ انبیاء کے ضمن میں بھی بڑی عجیب حقیقت سامنے آتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اصل معجزات دو تھے: عصائے موسیٰ اور یدِ بیضا۔ ویسے قرآن مجید نے ان کے نو معجزات بتائے ہیں: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ﴾ (بنی اسرائیل:۱۰۱) ’’اور ہم نے یقیناً موسیٰؑ کو نو کھلے کھلے معجزات عطا کیے‘‘ جو فرعون اور آلِ فرعون کو دکھائے گئے۔ پھر یہ کہ ان کے عصا کی ضرب سے سمندر کا پھٹ جانا‘ ایک چٹان سے بارہ چشموں کا پھوٹ بہنا‘ منّ وسلویٰ کا نزول‘ صحرا میں بادلوں کا سایہ نمایاں معجزات ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتیٰ اور خلقِ حیات کے بڑے بڑے معجزات عطا ہوئے جو خالص اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں۔ اصل میں ’’معجزہ‘‘ عاجز کر دینے والی شے کو کہتے ہیں۔ یوں تو اولیاء اللہ کی کرامات کے بھی ہم قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی نیک بندے کے مقام و مرتبہ کے اظہار کے لیے کسی وقت کوئی ایسی چیز ظاہر کر دے جو قانونِ طبیعی کے خلاف ہو۔ یہ کراماتِ اولیاء یقیناً حق ہیں اور جب ان کے لیے اس درجہ کی کرامات ہیں تو انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے تو یقیناً اس سے بڑھ کر ہوں گی۔ دراصل نبی یا رسول کا اصل معجزہ وہ ہوتا ہے جس کو وہ چیلنج کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ یہ ہے میری رسالت کا ثبوت! آؤ اس سے مقابلہ کر لو۔ سیرتِ مبارکہ ﷺ میں ہمیں بے شمار خرقِ عادت واقعات ملتے ہیں لیکن قرآن بار بار کہتا ہے کہ محمد ﷺ کا اصل معجزہ صرف اور صرف قرآن مجید ہے۔ اِسی کو بار بار پیش کیا گیا کہ آؤ اس کا مقابلہ کر لو۔

یہاں پر ایسا کوئی مغالطہ نہ ہو کہ حضور ﷺ کے بقیہ معجزات کی نفی کی جا رہی ہے۔ یہ خرقِ عادت واقعات اپنی جگہ پر حق ہیں کہ حضور ﷺ کو پتھر اور درخت بھی سلام کرتے تھے۔ جب مسجد نبویؐ میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ کے سبب ایک منبر بنایا گیا اور آپ ﷺ نے پہلی بار اس پر قدم مبارک رکھا تو جس کھجور کے سوکھے تنے کے ساتھ

حضور ﷺ ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے اُس سے ایسی آواز آنے لگی جیسے بچہ بلک بلک کر رو رہا ہوتا ہے کہ جو سعادت آج تک مجھے حاصل رہی تھی‘ اُس سے میں محروم ہو گیا۔ یہ انبیاء کرام علیہم السلام کا اعلیٰ مقام ہے۔ اسی لیے مولانا رومؒ نے فرمایا:

فلسفی کُو منکرِ حنانہ است
از حواسِ انبیاء بیگانہ است!

’’فلسفی (عقلیت پرست انسان) تو حنانہ کا انکار کر دے گا (کہ کیسے ممکن ہے کہ سوکھے تنے سے بچے کے بلکنے جیسی آواز آئے) اس لیے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے خصوصی احوال اور مقام و مرتبہ سے واقف ہی نہیں۔‘‘

اِس قسم کے خرقِ عادت واقعات حضور ﷺ کی زندگی میں بے شمار ہوئے لیکن آپ ﷺ کا وہ معجزہ جس سے تحدی کے ساتھ‘ چیلنج کے انداز میں کہا گیا کہ آؤ مقابلہ کرو‘ وہ صرف اور صرف قرآن مجید ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل (آیت ۸۸) میں تمام جنّ و اِنس کو اس جیسا قرآن لانے کا چیلنج دیا گیا۔ فرمایا:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝۸۸﴾

’’کہہ دیجیے: اگر تمام انسان اور جنّات اس بات پر جمع ہو جائیں کہ اِس جیسا قرآن لے آئیں‘ ہرگز نہیں لا سکیں گے اس کے جیسا‘ چاہے وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔‘‘

اس سے آگے بڑھ کر سورۂ ہود (آیت ۱۳) میں یہ بات کہی گئی:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۳﴾

’’کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے (یہ قرآن) خود گھڑ لیا ہے! تو آپ کہہ دیجیے کہ تم لے آؤ اِس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں اور تم بلا لو جس کو تم بلا سکو سوائے اللہ کے اگر تم سچے ہو۔‘‘

یعنی اگر پورا قرآن نہیں لا سکتے تو کم از کم اس قرآن مجید کی طرح کی دس سورتیں ہی تصنیف

کر کے لے آؤ۔ جب اس کا بھی جواب نہیں دیا جا سکا تو بر سبیلِ تنزل سورۃ یونس (آیت ۳۸) میں کہا گیا:

﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۸﴾﴾

''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو پیغمبرؐ نے خود گھڑ لیا ہے؟ آپ کہہ دیجیے پھر تم اس کے جیسی ایک ہی سورت بنا لاؤ اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کو چھوڑ کر اگر تم سچے ہو۔''

پھر ہجرت کے بعد مدنی دور میں سورۃ البقرۃ میں اس موضوع کو دُہرا دیا گیا:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾﴾

''اگر تمہیں کوئی شک ہے اس کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا (کہ یہ محمد ﷺ کا کلام ہے یا کوئی اور انسان ہے جو انہیں سکھا پڑھا رہا ہے) تو تم اس جیسی ایک سورت ہی لے آؤ (چاہے سورۃ العصر یا سورۃ الکوثر کی طرح تین آیات کی ہو) اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو اللہ کو چھوڑ کر اگر تم سچے ہو۔ اور اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو پھر ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

بہرحال اس تاریخی حقیقت کا کوئی کافر بھی انکار نہیں کر سکتا وہ قرآن مجید سے اِس درجہ مرعوب ہوئے کہ سرے سے اس چیلنج کو قبول کرنے کی کوئی بھی شخص جرأت نہیں کر سکا۔ حضور ﷺ کا اصل معجزہ جو آج تک زندہ ہے وہ قرآن مجید ہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات اُن کی اپنی ذات کے ساتھ تھے اور ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔ عصائے موسیٰ کئی سو برس تک تابوتِ سکینہ میں رکھا رہا لیکن پھر وہ محض سوکھی لکڑی تھا' معجزہ نہیں رہا۔ حضرت محمد ﷺ کی رسالت دائمی ہے یعنی تا قیامِ قیامت' لہٰذا آپ ﷺ کا معجزہ بھی نہ صرف آج تک موجود ہے بلکہ دائمی ہے۔

فصاحت و بلاغت

قرآن مجید کے اعجاز کے تین پہلو ہیں۔ پہلا پہلو اس کی فصاحت و بلاغت' اس کی ادبیت و چاشنی ہے۔ اس کا شعور و اِدراک اور اصل اندازہ اُسی دور کے عربوں کو ہو سکتا تھا کیونکہ قرآن مجید ان کی اُس وقت کی زبان میں نازل ہوا تھا۔ اس زبان کے فصحاء' بلغاء' شعراء' خطباء کو اتنا زعم تھا کہ وہ باقی پوری دنیا کو عجمی یا گونگا کہتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ بولنا ہمیں آتا ہے' شعر و خطبہ کہنا ہمیں ہی آتا ہے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ دوسروں کے کلام میں نہ فصاحت و بلاغت ہے' نہ کوئی چاشنی اور شکوہ۔ اُن کے سبعہ معلقہ میں سے آخری شاعر حضرت لبید بن ربیعہ عامری (رضی اللہ عنہ) تھے جو ایمان لے آئے تھے۔ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اُن سے سوال کیا کہ اب آپ شعر کیوں نہیں کہتے' تو انہوں نے کہا: أَبَعْدَ الْقُرْآن؟ کیا اب قرآن کے بعد؟ قرآن مجید تو فصاحت و بلاغت کی ایک معراج ہے جس تک کسی انسان کی رسائی ممکن نہیں۔ اس کی فصاحت و بلاغت اور ادبیت کا درحقیقت اہلِ زبان ہی کو ادراک ہو سکتا ہے۔ جو تراجم سے پڑھتے ہیں' چاہے کتنی ہی صرف و نحو یا گرامر پڑھ لیں' واقعہ یہ ہے کہ الفاظِ قرآنی کی feeling کو عجمی لوگ اُس طور سے محسوس نہیں کر سکتے جیسا کہ اہلِ زبان اس کو سمجھ سکتے ہیں' خاص طور پر جیسا کہ اُس زمانہ کے اہلِ زبان نے سمجھا۔ عربی جو ایک فصیح زبان ہے' وہ جوں کی توں اپنی اصل پر قائم ہے۔ ایسا اس قرآن مجید ہی کی وجہ سے ہے ورنہ دنیا میں کوئی دوسری زبان ایسی نہیں جو ۱۵۰۰ برس تک اصلی حالت میں رہ جائے اور اس میں تبدیلی نہ آئے۔ اردو زبان کو ۳۰۰ برس ہوئے ہیں لیکن آج اگر دکن کی اردو پڑھی جائے تو وہ موجودہ اردو سے بہت مختلف ہے' یعنی ۲۰۰ سے ۲۵۰ برس میں اردو میں انقلاب آ چکا ہے۔ لہٰذا تمام اہلِ عرب کے لیے بھی اب قرآن مجید کے اعجاز کے اس پہلو کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔

قرآن مجید کی ادبیت کا چرچا تو ہوتا ہے لیکن اس کے اعجاز کے باقی دو پہلو ہماری توجہ کے خاص طور پر حق دار ہیں' جن کی طرف ہمیں ضرور توجہ کرنی چاہیے۔ اصل میں

قرآن مجید علمِ انسانی کی معراج ہے۔ اس کی ابدی حکمت اور فکر و فلسفہ لازوال ہے۔ پھر یہ کہ قرآن مجید انسانی مسائل کے حل کی طرف مکمل رہنمائی کرتا ہے۔

فکر و فلسفہ کا ماخذ

اس دور میں قرآن مجید کے اعجاز کی سب سے بڑی دلیل خاص طور پر علامہ اقبال کی شخصیت کو کہا جا سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلق علماء کرام کے طبقہ سے نہیں تھا۔ جن لوگوں کی پوری زندگی' اُن کے شب و روز ہی قال اللہ اور قال الرسول میں گزرتے ہوں' اُن کے دل میں قرآن مجید کی عظمت' رسول اللہ ﷺ کی محبت ہونی ہی چاہیے۔ البتہ ایک ایسا شخص جس نے کالج' یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی' مشرق و مغرب کے فلسفے کھنگال ڈالے اور وہ بھی اُس دور میں جب ہم پر مغرب سے مرعوبیت بہت شدید تھی۔ آج تو وہ مرعوبیت بہت کم ہو چکی ہے۔ آج کے مسلمان نوجوان میں خود اعتمادی ہے۔ وہ اسلام کے معاشی' سیاسی' سماجی نظام اور معاشرتی اقدار (social values) سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے جس میں زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ احیاء اسلام کی جِدّ و جُہد مرحلہ در مرحلہ آگے بڑھ رہی ہے۔ وقت لگے گا لیکن الحمد للہ اس میں یقیناً ترقی ہوئی ہے۔ علامہ اقبال بیسویں صدی کے آغاز میں یورپ گئے جبکہ ہم انگریز کے محکوم تھے اور مسلمانوں میں شدید مرعوبیت پائی جاتی تھی۔ جو وہاں جاتا تھا' ان کا سالباس' ان کی وضع قطع' ان کی تہذیب و تمدن اپنا لیتا تھا۔ ہر طرح سے اُن کے رُنگ میں رنگا ہوا اور ان کی تعریف میں قصیدے کہتا ہوا واپس آیا کرتا تھا۔ ایک علامہ اقبال کی وہ شخصیت ہے کہ انہوں نے خود کہا: ع ''کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل۔'' یعنی مغربی تہذیب کے اس الاؤ میں مجھے اللہ تعالیٰ نے اس طرح ڈالا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا۔ میں اُس تہذیب کے الاؤ کے اندر سے ہو کر آ رہا ہوں اور میں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ یہ تہذیب اندر سے کھوکھلی ہے' اس کے اندر کوئی پائیداری نہیں۔ علامہ اقبال نے کہا: ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

اور یہ کہ: ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو' وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہوگا!

اندازہ کریں کہ جو شخص بنیادی طور پر فلسفہ کا طالب علم ہے اسے جرمنی اور انگلستان کی یونیورسٹیوں میں قدیم و جدید فلسفے کھنگالنے کے بعد اگر تسکین حاصل ہوئی' اس کے علم کی پیاس کو سیری اگر میسر ہوئی تو صرف قرآن مجید کے ذریعہ سے ہوئی۔ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں!

یہ وہ شخص ہیں جو اپنی آخری زندگی میں بیشتر وقت قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔ اپنے گھر سے انہوں نے ساری کتابیں اُٹھوا دی تھیں' صرف قرآن مجید موجود تھا۔ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے آخری عمر میں علامہ اقبال سے پوچھا کہ آپ کے فلسفہ خودی کا ماخذ (source) کیا ہے! علامہ اقبال نے کہا کہ کل آ جانا۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ یہ سعادت میرے حصہ میں آ رہی ہے کہ وہ اپنے فلسفہ خودی کا ماخذ مجھے خود تحریر کروائیں گے۔ جب وہ اگلے دن پہنچے تو علامہ اقبال نے اُن سے کہا: ذرا قرآن مجید نکال کر لے آؤ اور سورۃ الحشر کا آخری رکوع کھولو۔ پھر یہ آیت پڑھی:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١٩﴾﴾

''اُن لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے بھلا دیا (اپنی خودی سے غافل کر دیا' اپنے آپ سے بیگانہ بنا دیا) یہی لوگ

فاسق ہیں۔‘‘

پھر فرمایا کہ میرے فکر وفلسفہ کی اصل بنیاد یہی آیت ہے۔

میں اسی وجہ سے اِس دور میں علامہ اقبال کی شخصیت کو اعجازِ قرآن کا سب سے بڑا مظہر سمجھتا ہوں۔ بیسویں صدی عیسوی کا ایک عظیم شخص جو کسی مسجد‘ مدرسہ کے ماحول میں نہیں پلا بڑھا بلکہ سکول‘ کالج‘ یونیورسٹی میں پڑھا لکھا اور صرف ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ انگلستان‘ جرمنی کی یونیورسٹی میں بھی گیا لیکن پھر بھی وہ کہتا ہے کہ میرے فکر کی بنیاد‘ میرے فلسفہ کی source‘ میری تمام سوچ کی رہنمائی قرآن مجید نے کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن مجید واقعتاً آج بھی معجزہ ہے۔

تمدنی مسائل کا حل

قرآن مجید کے اعجاز کا تیسرا اہم پہلو اِس دور کے لحاظ سے اہم تر ہے کہ عملی لحاظ سے انسان کے لیے پیچیدہ تمدنی مسائل کا کیا حل ہو! قرآن مجید نے سوشل سائنسز کے حوالہ سے جس جس طرح سے رہنمائی کی ہے‘ ہمیں اس کا شعور و ادراک بہت ضروری ہے۔ سیاسی‘ معاشرتی‘ معاشی مسائل! مثلاً مَرد اور عورت کے حقوق و فرائض میں توازن کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ عورت کو بھیڑ بکری کی طرح ملکیت بنا لیا جائے یا پھر ملکہ بن کر وہ قوموں کی قسمت سے کھیلے؟ دنیا میں یہ دو انتہائیں ہیں مگر نقطہ عدل کہاں ہے؟ مَردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض میں صحیح ترین نسبت کیا ہے؟ اسی طرح فرد و ریاست کا معاملہ کہ یا تو مادر پدر آزادی دے دی جائے کہ دو مَردوں کو بھی میاں بیوی کی صورت تسلیم کر کے قانونی تحفظ دے دیا جائے‘ یا دوسری طرف فرد کی آزادی بالکل ختم کر دی جائے کہ اس کے پاس ملکیت کا حق بھی نہ ہو‘ جیسے روس یا دوسرے اشتراکی ممالک میں ہے۔ اسی طرح سرمایہ و محنت کا توازن کیسے ہو؟ اگر سرمایہ دار یا جاگیردار کو کھلی چھوٹ دے دی جائے تو وہ مزدور یا کاشت کار کا خون چوستا ہے۔ دوسری طرف مزدور یا کارکن کو تحفّظ دے دیا جائے تو وہ کام نہیں کرتا‘ نتیجتاً معیشت ڈوبنے لگتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان پیچیدہ مسائل کا حل قرآن مجید میں موجود ہے مگر ہم بدقسمتی سے اِن چیزوں کے حل کے لیے دوسروں سے

بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہمارا حال تو یہ ہوا تھا کہ بیسویں صدی کے شروع میں مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں اسلام کے عائلی قوانین بھی منسوخ کیے۔ یہ دراصل اس صدی کا المناک واقعہ ہے کہ جب عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت (revolt) کی۔ ایک انگریز کرنل لارنس کی ریشہ دوانیوں پر ترکوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپا جس کے نتیجہ میں عظیم سلطنتِ عثمانیہ کے چیتھڑے اُڑ گئے۔ انگریز نے عربوں کو پوری حکومت دینے کا وعدہ کیا تھا جبکہ سلطنتِ عثمانیہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے مسلمانوں کو تقسیم کر دیا اور مغربی سامراج کا دور شروع ہو گیا۔ مصطفیٰ کمال پر اس کا ردِّعمل اِس درجہ شدید ہوا کہ اُس نے ہر اُس چیز کو جس کا تعلق عربوں سے تھا‘ اپنے ملک سے ختم کر دیا۔ عربی میں اذان نہیں ہوگی‘ عربی میں نماز نہیں پڑھی جائے گی! اور پھر وہ اس حد تک گیا کہ فیملی لاز بھی رومن نافذ کر دیے۔ اس پر اُس وقت کے یورپی اخبارات نے طنز کیا تھا کہ یہ مسلمان عجیب قوم ہیں‘ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس دنیا کا بہترین ضابطہ و قانون ہے اور حال یہ ہے کہ فیملی لاز کے لیے بھی ہم سے بھیک مانگ رہے ہیں۔ آج بدقسمتی سے اکثر و بیشتر مسلم ممالک میں فیملی قوانین رومن اور انگریز کے نافذ ہیں۔ جمہوریت کا فلسفہ‘ سوشلزم کا نظام‘ مَرد و عورت کی کامل مساوات (شانہ بشانہ) کے نظریات ہم مغرب سے مانگ کر قبول کر رہے ہیں۔ کاش کہ قرآن مجید کے اس اصل اعجاز کی جانب توجّہ کی جائے کہ آج کے دور کے لیے بھی اس میں بہترین نظام ہے۔

قرآن مجید کے اعجاز کے اوّلین پہلو یعنی اس کا فصاحت و بلاغت کی معراج ہونے کا معجزہ‘ کی قدر تو اہلِ عرب ہی کر سکتے ہیں اور ان میں سے بھی درحقیقت اُس زمانہ کے عرب جو قدیم جاہلی شاعری کے جاننے والے ہیں۔ البتہ دوسرا پہلو یعنی فکر و فلسفہ جس کے اعتبار سے اس کا سب سے بڑا ثبوت اس دور میں علامہ اقبال کی شخصیت ہے‘ اور پھر تیسرا یعنی معاشی و سماجی و سیاسی پہلو کے لیے قرآن مجید نے جس طرف راہنمائی کی ہے اُس نظام کو ہم سمجھیں اور دنیا کے سامنے دین اسلام کا یہ نظام پیش کریں‘ تب درحقیقت قرآن مجید کا اعجاز سامنے آئے گا۔ (جاری ہے)

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۳)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تاویلِ خاص اور تاویلِ عام

سورۃ البقرہ کے پہلے دو رکوع تمہیدی نوعیت کے ہیں۔ ان کے ضمن میں تاویلِ عام اور تاویلِ خاص کی دو اصطلاحات خاص طور پر نوٹ کر لیجیے کہ قرآن حکیم ایک خاص وقت اور مخصوص ماحول میں‘ ایک خاص time and space complex میں نازل ہوا۔ ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء کا زمانہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ اکثر و بیشتر حجاز میں نازل ہوا‘ اس لیے کہ مکّہ مکرمہ بھی حجاز میں ہے اور مکّی دور میں آپ ﷺ کے جو سفر ہوئے وہ سب کے سب بھی حجاز میں تھے۔ طائف بھی حجاز کا شہر ہے‘ پھر ہجرت فرما کر آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو وہ بھی حجاز کا شہر ہے۔ پھر آپ ﷺ نے مختلف غزوات کے سلسلہ میں جو سفر کیے وہ تقریباً سب کے سب حجاز میں ہیں۔ آپ ﷺ کا سب سے طویل سفر غزوۂ تبوک کا ہے اور وہ بھی حجاز کا سرا ہے۔

آپ ﷺ کی اوّلین مخاطب ایک قوم تھی جس کے کچھ عقائد و نظریات تھے۔ اس کی کچھ اخلاقی حالت تھی۔ کچھ ثقافتی‘ تہذیبی اور اجتماعی کیفیات تھیں۔ یہ بھی ایک خاص پس منظر ہے جس میں کہ قرآن نازل ہو رہا ہے۔ اسی طریقے سے جو سورتیں اور آیات مختلف مواقع پر نازل ہوئیں‘ ان کا ایک واقعاتی پس منظر بھی ہے۔ ہجرتِ مدینہ سے قبل نازل ہونے والی سورتیں مکّی جب کہ ہجرت کے بعد نازل ہونے والی سورتیں مدنی کہلاتی ہیں۔ سورۃ البقرۃ ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد سے غزوۂ بدر سے متصلاً قبل تک نازل ہوئی‘ ماسوائے چند آیات کے کہ جو پہلے یا بعد میں نازل ہوئیں۔ پوری سورۂ مبارکہ میں زیادہ

سے زیادہ پانچ یا چھ آیات ہوں گی جو اس عرصے سے باہر ہوں‘ ورنہ پوری سورت اسی عرصے میں نازل ہوئی۔ ایک خاص وقت میں جو آیات نازل ہو رہی ہوتیں تو ان کا ایک خاص ماحول اور سیاق و سباق (context) ہے۔

یہ ہے تاویل خاص کہ اس ماحول اور context میں رکھ کر سمجھنا‘ غور و فکر کرنا کہ اُس وقت ان افراد پر کیا مفہوم واضح ہوا جنہوں نے پہلی مرتبہ یہ آیات محمّد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے سنیں۔ بسا اوقات ایک روئے سخن یا گفتگو کی طرف انگلی اُٹھا کر اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ البتہ دوسری طرف یہی کلام پاک اَبدی اور ہمیشہ ہمیش کے لیے ہدایت ہے۔ یہ صرف اُس دور اور صرف اُس علاقے کے لوگوں کے لیے نازل نہیں ہوا‘ بلکہ پوری نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے۔ اس کو تمام انسانوں کی ضروریات ابدالآباد تا قیامِ قیامت پورا کرنی ہیں۔ اس کے اعتبار سے اصول یہ ہے: الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوص السبب یعنی اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ خاص شانِ نزول کا۔ جب قرآن مجید پر غور کیا جائے گا اور تاویل عام کی جائے گی تو الفاظ کے عموم پر نگاہ ہوگی‘ اگرچہ اسے اس کے تاریخی پس منظر سے کاٹ بھی دیا جائے۔ فرض کریں کسی کو کسی آیت یا کسی سورت کا تاریخی پس منظر نہیں معلوم‘ تب بھی بہرحال الفاظ اور اُن کے معنی پیش نظر رکھے جائیں گے۔ اُن الفاظ کا معنی کے اعتبار سے مفہوم سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ تاویل عام ہوگی۔ ان دو رکوعوں کے اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت ہے کہ تاویل خاص کے حوالے سے اس کا مفہوم علیحدہ سمجھا جائے اور تاویل عام کے حوالے سے علیحدہ سمجھا جائے۔

ان دو رکوعوں میں لوگوں کو تین اقسام میں ممیز کر دیا گیا ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس قرآن سے ہدایت پائی ہے یا جو اس قرآن سے ہدایت پا سکتے ہیں۔ پہلی پانچ آیات کا مطالعہ کریں تو دوسری آیت میں الفاظ آتے ہیں: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾ یعنی یہ کتابِ ہدایت ہے ایسے متقیوں کے لیے جن کی صفات آگے آ رہی ہیں‘ لیکن اختتام ہو رہا ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ کہ یہی متقی لوگ اپنے ربّ کی طرف سے

ہدایت پر ہیں۔ ابتدا میں ایک آیت میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ اس کی ہدایت سے استفادہ کون کر سکتے ہیں یا کن لوگوں نے کیا ہے جبکہ پھر آیت ۵ میں بیان کر دیا گیا کہ یہی وہ لوگ ہیں کہ جنہیں اس کتاب سے ہدایت ملی ہے۔ یہ اس کا نمونہ ہیں‘ مرقع ہیں۔ جیسے درخت کو اس کے پھل سے پہچانا جاتا ہے‘ اس کتاب کی تاثیر کو دیکھنا ہو‘ اس کی ہدایت کے اثرات کو دیکھنا ہو‘ اس کی کیمیا گری کا مشاہدہ کرنا ہو تو دیکھ لو یہ محمد ﷺ کے ساتھی‘ صحابہ کرامؓ موجود ہیں۔ ابوبکرؓ‘ عمرؓ‘ عثمانؓ‘ علیؓ‘ حمزہؓ‘ طلحہؓ‘ زبیرؓ‘ مصعب بن عمیرؓ اور بلالؓ‘ یہ سب اس شجرِ نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے پھل ہیں۔ اس اعتبار سے جو تاویل خاص ہم کر رہے ہیں اس کی رو سے تو اِن کا مصداق ہیں صحابہ کرامؓ‘ جن کی ایک بڑی جمعیت ہجرت کر کے نقل مکانی کر کے حضور ﷺ کے ساتھ مدینہ آئی۔ حضور ﷺ تنہا نہیں آئے تھے‘ بلکہ اکثر صحابہؓ مدینہ پہلے تشریف لا چکے تھے‘ کیونکہ انہیں ہجرت کی اجازت دے دی گئی تھی۔ آپ ﷺ خود منتظر رہے اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح اور صریح اجازت آ گئی تو پھر ہجرت کا سفر کیا۔ گویا کہ یہ ایک گروہ تھا جو پہلے مدینہ پہنچ گیا اور اُن کی طرف انگلی اُٹھا کر اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اگر اس الکتاب کی برکات وثمرات کا مشاہدہ کرنا ہو‘ اس کے اندر مضمر ہدایت کا ثبوت دیکھنا ہو تو یہ صحابہؓ کی جماعت موجود ہے۔ یہ ہے تاویل خاص۔ جب کہ تاویل عام یہ ہو گی کہ ہمیشہ ہمیش کے لیے بھی اس کتاب سے اگر کسی کو ہدایت پانی ہے تو اس کی کچھ شرائط ہیں۔ اگر یہ شرائط پوری نہیں کی جائیں گی تو اس کتابِ ہدایت سے استفادہ ممکن نہیں۔

تقویٰ: لغوی اور اصطلاحی مفہوم

تقویٰ کی اصل اساس کیا ہے؟ تقویٰ بنا ہے وَقٰی یَقِی سے‘ جس کے معنی ہیں بچانا۔ اِسی سے فعل امر ہے اس دُعا میں: وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ فعل امر صرف ''قِ'' ہے جبکہ ''و'' اس میں حرفِ عطف ہے۔ ''وَقٰی'' سے بابِ افتعال میں ماضی کا صیغہ ''اِوْتَقٰی'' بنتا ہے ''و'' کے ساتھ‘ لیکن ''و'' تبدیل ہو جاتا ہے ''ت'' میں اور ادغام کے بعد یہ ''اِتَّقٰی'' بن جاتا ہے۔ اِتَّقٰی کا لغوی اور بنیادی مفہوم ہے بچنا۔ اس سے اسم الفاعل ہے ''مُتَّقِی''

جس کی جمع یہاں آئی ہے: اَلْمُتَّقِیْنَ‘ بچنے والے‘ بچنے کی خواہش رکھنے والے۔ جن کی فطرت صحت وسلامتی پر قائم ہے‘ مسخ (pervert) نہیں ہوئی‘ تو ان کے اندر اخلاقی حس ہو گی۔ وہ پہچانیں گے کہ یہ نیکی ہے‘ یہ بدی ہے‘ اور بدی سے بچنا چاہیے۔ یہ جذبہ جن کے اندر ہے وہ طالبِ ہدایت ہیں۔ انہیں قرآن مجید کی ہدایت فائدہ پہنچائے گی۔ اس اعتبار سے یہ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے۔

اس کا تقابل کریں اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۸۵ کے ساتھ‘ جہاں رمضان المبارک کا ذکر آیا ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ ۚ﴾

''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کی روشن دلیلوں کے ساتھ۔''

وہاں ''هُدًی لِّلنَّاسِ'' آیا کہ تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ سورۂ آلِ عمران کے آغاز میں بھی آیا: ''هُدًی لِّلنَّاسِ'' کہ یہ کتاب تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔

قیامِ پاکستان سے تقریباً ۷۰ برس قبل ''ستیارتھ پرکاش'' نامی کتاب لکھی گئی‘ جس کا مصنف سوامی دیانند سرسوتی تھا۔ اس کتاب کے چودھویں باب میں قرآن مجید پر اعتراضات تھے۔ ان میں ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ عجیب کتاب ہے جو هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے یعنی یہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ متقی تو پہلے ہی پرہیزگار ہیں‘ خدا ترس ہیں‘ نیک ہیں۔ تو ایک متقی انسان کو اب ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ ہدایت کی ضرورت تو ہے گمراہوں کو‘ بھٹکے ہوؤں کو‘ یا جو تلاشِ حق میں سرگرداں ہوں۔ جس کے پاس پہلے ہی سے تقویٰ ہو‘ اسے ہدایت کی ضرورت کیا ہے؟ اس چیز کو سمجھ لیں کہ لفظ ''تقویٰ'' کا بہت broad spectrum ہے۔ چنانچہ متقی کے یہ معنی بھی ہوں گے کہ جس میں اخلاقی حس برقرار ہے‘ اور نیکی بدی میں تمیز کرنے کی صلاحیت درحقیقت صحتِ فطرت کی علامت ہے۔ یہاں سے آگے چلیے‘ جس میں یہ حس ہے وہ بدی سے بچے گا۔ پھر مزید آگے بڑھ کر جس

نے اپنے ربّ کو پہچان لیا‘ وہ اگر اللہ کی کتاب سے واقف ہے اور اس پر عمل کرتا ہے تو اب اس کے اندر تقویٰ پیدا ہوگا۔ وہ ایک ایسا شخص ہوگا جو اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچتا ہو‘ اللہ کے عذاب سے بچنے کے لیے کوشاں ہو۔ یہ اب اصطلاحی معنی میں متقی بن گیا۔ اصطلاحی معنی میں متقی وہ شخص ہے جو پرہیزگار ہے‘ بدی سے اور گناہوں سے بچتا ہے‘ اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچتا ہے‘ اُس کے احکام پر عمل پیرا ہے‘ عذابِ جہنم سے لرزاں و ترساں رہتا ہے‘ بچنا چاہتا ہے۔ آخرت کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے۔ البتہ ابتدائی درجے میں متقی کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ جس کے اندر اخلاقی حس بیدار ہے اور وہ نیکی و بدی میں تمیز کرتا ہے۔ جس میں یہ بھی نہیں ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسے ہی ہے جیسے اندھے کے سامنے آپ نے ہیرے بکھیر دیے‘ وہ نہیں دیکھ سکتا کہ ہیرے اور کانچ کے ٹکڑے میں کیا فرق ہے۔ اسی طرح بھینس کے آگے بین بجائی جائے تو اسے کیا پتا کہ یہ کیا عمل ہے جو میرے سامنے کیا جا رہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ عمدہ تشبیہ یہ ہو سکتی ہے کہ جس شخص کو سرے سے بھوک ہی نہیں‘ اس کے سامنے بہترین کھانے رکھ دیجیے مگر اس کو ان کی رغبت ہی نہیں ہوگی‘ وہ ہاتھ ہی نہیں بڑھائے گا‘ جیسے بعض بیماریوں میں بھوک مر جاتی ہے۔ بچوں کے لیے مائیں خوشامدیں کرتی ہیں کہ یہ لے لو‘ یہ کھا لو‘ لیکن کسی شے کی طرف بچہ رُخ کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسی طرح جس میں طلب ہی نہیں ہے‘ اعلیٰ سے اعلیٰ شے اس کے سامنے رکھ دیں اسے اس کی رغبت نہیں ہوگی‘ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوگا۔

چنانچہ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ کی ابتدائی لغوی مفہوم کے اعتبار سے تاویل عام یہ ہوگی کہ قرآن سے ہدایت کی شرطِ لازم یہ ہے کہ انسان کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز موجود ہو اور اس کے اندر بدی سے بچنے کا ایک جذبہ پایا جائے۔ اگر یہ طلب موجود ہے تو وہ قرآن مجید کی ہدایت سے استفادہ کر سکے گا‘ ورنہ نہیں۔ تاویل خاص کے اعتبار سے ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ کا مفہوم یہ ہوگا کہ دیکھو یہ ہے متقیوں کی جماعت‘ جیسے کبارِ صحابہؓ جن کی تربیت قرآن کی نظری‘ فکری اور علمی ہدایت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ حضور ﷺ کی تیرہ برس کی تربیت و تزکیہ سے مستفید ہونے والوں کی جماعت تمہاری آنکھوں کے سامنے موجود

ہے‘ یہ گلدستہ موجود ہے‘ اسے دیکھ لو۔ یہ کتابِ ہدایت ہے‘ جس کی ہدایت کا مرقع‘ جس کا مظہر‘ جس کی برکات کا ظہور ان اشخاص کی زندگیوں میں نظر آ رہا ہے جو تمہارے سامنے موجود ہیں۔

آیت ۳ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ ’’وہ لوگ کہ جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر‘‘ یا ’’ایمان رکھتے ہیں غیب میں ہوتے ہوئے۔‘‘ یہاں پر بِ کو اگر صلہ مانا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ کن کن چیزوں پر ایمان‘ جیسے کہ ایمان بِاللّٰہ (اللہ پر ایمان)‘ ایمان بالآخرۃ (آخرت پر ایمان)‘ ایمان بالرسول (رسول پر ایمان)۔ اَمِنَ یَأْمَنُ: امن میں ہونا۔ باب افعال میں آمَنَ یُؤْمِنُ: کسی کو اَمن دینا۔ اس کے بعد جب ’’بِ‘‘ یا ’’لَ‘‘ آ جائے تو کسی کی تصدیق کرنا‘ وثوق اور اعتماد کے ساتھ کسی کو ماننا۔ یہ اس کا اصطلاحی مفہوم ہے۔ چنانچہ اگر ’’بِ‘‘ کو صلہ مانا جائے تو اس کا معنی ہوگا کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔

ایمان بالغیب کے تین مفہوم

(۱) غیب کی چیزوں پر ایمان: ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ایمانیات کے جتنے بھی اجزاء (articles of the faith) ہیں‘ جن جن چیزوں پر ایک بندۂ مومن سے ایمان مطلوب ہے‘ وہ تمام چیزیں غیب سے متعلق ہیں۔ بظاہر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو اُن کے سامنے موجود تھے‘ غیب میں تو نہیں تھے‘ لیکن غور کریں رسول جو اُن کے سامنے تھے وہ ایک بشر تھے۔ عبداللہ کے بیٹے‘ عبدالمطلب کے پوتے‘ ابوطالب کے بھتیجے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے شوہر تھے۔ وہ ایک رسول تھے اور رسول کا رسول ہونا غیب سے متعلق شے ہے۔ یہ تو ان کے مشاہدے کی چیز نہیں تھی۔ اس اعتبار سے ایمان درحقیقت کُل کا کُل ایمان بالغیب ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے قرآن تو ہمارے سامنے موجود ہے‘ لیکن ہمارے سامنے تو ایک عربی میں لکھی ہوئی مطبوعہ کتاب

ہے۔اس قرآن کا کتاب اللہ اور کلام اللہ ہونا غیب سے متعلق شے ہے۔اللہ تعالیٰ اگرچہ ہر جگہ اور ہر آن موجود ہے: ﴿هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ (الحدید:۴) ''اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے''لیکن غیب کا پردہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے درمیان حائل ہے۔ایمان درحقیقت کُل کا کُل غیب پر ہے' چاہے بظاہر وہ ایسی چیز بھی ہو جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ وہ ہمارے سامنے ہے۔حقیقت میں رسول ﷺ کی ذات' کتاب اللہ اور رسول کی رسالت غیب سے متعلق ہے۔ہمارے سامنے رسول اللہ ﷺ نہیں ہیں لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے تو موجود تھے۔تب بھی آپ ﷺ کی رسالت غیب سے متعلق تھی۔اسی طرح قرآن کا کتاب اللہ' کلام اللہ ہونا بھی غیب سے متعلق ٹھہرا۔تو فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ ''جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔''

حکمت (wisdom) کا نقطۂ آغاز ہی یہ ہے کہ انسان سمجھ لے کہ اس کائنات میں جو کچھ سامنے نظر آ رہا ہے' کُل حقیقت یہ نہیں ہے۔یا یہ سمجھ لے کہ ہمارے ان حواس کے ذریعے اصل حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔اصل حقیقتیں وہ ہیں جو ہمارے حواس سے ماوراء ہیں۔یہ تو بہت ہی کم ہے جو نظر آ رہا ہے۔یہ tip of the iceberg کی مانند ہے۔اصل آئس برگ پانی کی سطح کے نیچے ہے' جو نظر نہیں آ رہا' وہ چھپا ہوا ہے۔اس حقیقت کو جان لینا حکمت کا آغاز ہے۔کنفیوشس چین کے ایک حکیم اور دانا انسان تھے۔ انہوں نے بڑی پیاری بات کہی:

"There is nothing more real than what cannot be seen, and there is nothing more certain than what cannot be heard."

''جو چیزیں ان آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتیں' ان سے زیادہ حقیقی چیز اور کوئی نہیں اور جو باتیں ان کانوں سے نہیں سنی جا سکتیں اُن سے زیادہ یقینی باتیں کوئی نہیں۔''

معلوم ہوا کہ ہمارے حواس کی رسائی تو بہت ہی محدود ہے۔اصل حقائق پردۂ غیب میں

مستور ہیں' جن تک ہمارے حواس کی رسائی نہیں ہے۔یہ گویا حکمت کا نقطۂ آغاز ہے: ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾۔

غیب کے مقابلے میں لفظ آئے گا تجربہ و شہود اور اسی پر آج کے انسان کے فکر کا اصل تانا بانا بُنا ہے۔آج کے Scientific Era کے انسان کی جو تہذیب ہے' اُس کی بنیاد اس فکر پر ہے کہ ماورائی حقائق کی ہم نفی نہیں کرتے۔شاید کوئی خدا' کوئی خالق (Creator) ہو' لیکن اُسے چونکہ ہم نہ چھو سکتے ہیں نہ ہمارے حواس کی وہاں تک رسائی ہے' لہٰذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ واقعتاً موجود ہے۔شاید ہو' شاید نہ ہو۔اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ممکن ہے ہو' ممکن ہے نہ ہو۔اس لیے کہ کسی نے موت کی سرحد کے پار جھانک کر نہیں دیکھا اور کسی نے واپس آ کر خبر نہیں دی۔اسی طرح روح کوئی شے ہے یا نہیں' ہم نہیں کہہ سکتے۔جسم تو موجود ہے' اس کی فزیالوجی کا علم بھی ہمارے سامنے ہے' اس کی Anatomy بھی ہم جانتے ہیں لیکن روح کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں' ہم نہیں جانتے۔نتیجتاً ماورائی چیزوں سے توجہ ہٹ گئی اور اصل بحث' اصل جستجو' اصل دلچسپی اُس عالمِ محسوس و مشہود سے ہے جس تک ہمارے حواس کی رسائی ہے۔یہ دنیاوی زندگی سامنے موجود ہے۔اس کا نفع بھی محسوس' اس کا نقصان بھی محسوس' اس کی لذتیں بھی انسان کو محسوس ہوتی ہیں' اس کی کلفتیں بھی انسان محسوس کرتا ہے۔یہ کائنات تو موجود ہے البتہ اس سے ماوراء کوئی اور عالَم ہے' کوئی عالمِ اَمر بھی ہے' ہم نہیں کہہ سکتے۔ملائکہ اور جِنّات ہیں یا نہیں' ہم نہیں کہہ سکتے۔جن کو ہم نے دیکھا ہی نہیں' جو ہمارے حواس کی گرفت میں آتے ہی نہیں' وہ ہیں یا نہیں' ہم نہیں جانتے۔اس طریقے سے آج کے انسان کی پوری سوچ' تجربہ اور شہود کی بنیاد یہ ہے کہ جو چیز ہمارے experience میں آئے' ہمارے حواس کی گرفت میں آئے اور اس تک حواس کے ذریعے رسائی ہو سکے۔یہی انسان کی دلچسپی' اس کی گفتگو اور اس کی تحقیق و تفتیش کا مرکز اور focus بن چکا ہے۔

قرآن مجید پہلے ہی قدم پر' آغاز ہی میں واضح کر رہا ہے کہ ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ ''وہ لوگ جو غیب پر ایمان لائے ہیں۔'' بریڈلے کی بڑی مشہور کتاب ہے:

''Appearance and Reality'' جس میں اُس نے واضح کیا ہے کہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے' نظر کچھ اور آ رہی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے جو کوئی ان حقائق تک پہنچا ہو وہ قرآن کی ہدایت سے استفادہ کر سکے گا۔ یہ تاویل عام ہوگی۔ اس کی شرطِ اوّل یہ ہے کہ اس کے اندر اخلاقی حس برقرار ہو' نیکی اور بدی کی تمیز موجود ہو' نیکی کی طرف فی الجملہ رغبت اور بدی سے فی الجملہ نفرت موجود ہو۔ یہ ایک علامت ہے' شرطِ اوّل ہے تاویل عام کے اعتبار سے' قرآن حکیم کی ہدایت سے مستفید ہونے کے لیے۔

پھر یہ بات پیشِ نظر رہے کہ حکمت کا نقطۂ آغاز ہی یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے یہی سب کچھ نہیں ہے۔ یہ ہمارا مادّی عالَم جو ہمارے حواس کی دسترس میں ہے' اس سے ماوراء بھی بہت کچھ ہے۔ انسان نے ٹیلی سکوپ ایجاد کر لی ہے تو وہ بینائی کے لیے محض ایک aid ہے' اس میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔ دیکھنے والی شے تو یہی آنکھ ہے۔ اسی طرح مائیکروسکوپ ایجاد کر لی تو دیکھنے والی شے تو یہی آنکھ ہے۔ بصارت کی صلاحیت ہی کو بڑھا دیا گیا ہے' چاہے ٹیلی سکوپ کے ذریعے فاصلے کے اعتبار سے' اور چاہے مائیکروسکوپ کے ذریعے اس کی تفاصیل اور باریکیوں کے اعتبار سے۔ اصل شے تو یہی آنکھ ہے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ واقعہ یہ ہے کہ جو اصل حقائق ہیں اس کائنات کے' کون و مکان کے' وہ تو غیب سے متعلق ہیں۔ تاویلِ عام کے اعتبار سے یہ مفہوم ہوا۔

تاویلِ خاص کے اعتبار سے دیکھیں تو اُس وقت موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ یہ اللہ کو مانتے ہیں' آخرت کو مانتے ہیں' وحی کو مانتے ہیں' نبوت و رسالت کے قائل ہیں' بعث بعد الموت کے قائل ہیں' جنت کو مانتے ہیں' دوزخ کو مانتے ہیں' فرشتوں کو مانتے ہیں' جنّات کے وجود کے قائل ہیں۔ یہ سورۂ مبارکہ اس وقت نازل ہو رہی ہے جبکہ قرآن کو نازل ہوتے ہوئے تیرہواں برس ہے۔ بارہ برس میں دو تہائی قرآن نازل ہو چکا تھا جس میں ایمان سے متعلق مفصّل بحثیں آ چکیں۔ اس اعتبار سے تاویل خاص زمانۂ نزول کے اعتبار سے دیکھیں گے۔ اس خاص context میں رکھ کر اِن آیات پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ جماعت جو محمد رسول اللہ ﷺ کی مسیحائی

اور آپ ﷺ کی تربیت و تزکیہ کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی' نظر آ رہا ہے کہ وہ غیب پر یقین رکھتے ہیں' اور یقین بھی اتنا پختہ کہ اپنے حواس سے حاصل ہونے والی معلومات کو اتنا یقینی نہیں سمجھتے جتنا ان کو جو غیب کی خبریں محمد رسول اللہ ﷺ نے دی ہیں۔ ان معلومات پر ان کا یقین کہیں زیادہ ہے ان چیزوں سے جو آنکھوں سے نظر آنے والی اور کانوں سے سنی جانی والی ہیں۔

(۲) غیب میں رہتے ہوئے ایمان: دوسرا مفہوم اس کا یہ لیا گیا ہے کہ یہ بِ ظرفیہ ہے۔ اس اعتبار سے ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ غیب میں رہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں۔ اصل میں یہ بڑی عمدہ تعبیر ہے اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے بڑے شدّ و مدّ کے ساتھ یہ دوسری رائے ظاہر کی ہے۔ عام طور پر مفسّرین کی رائے وہی ہے جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ قرآن مجید میں بِ ظرفیہ کا بہت سے مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

﴿الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿٤٩﴾﴾

(الانبیاء)

''جو ڈرتے رہتے ہیں اپنے ربّ سے غیب میں (ہونے کے باوجود) اور وہ قیامت (کے تصور) سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔''

یہاں بِالْغَيْبِ کا معنی ''غیب پر'' نہیں ہو سکتا۔ یہ بڑا پیارا انداز ہے۔ اصل میں اللہ غیب میں نہیں ہے' غیب میں ہم ہیں۔ غائب ہم ہیں' اللہ غائب نہیں ہے۔ ہمارے اور اللہ کے مابین غیب کا پردہ حائل ہے۔ اب ہم محجوب ہیں یا اللہ! اللہ غیب میں ہے یا ہم غیب میں ہیں! یہ بڑی خوبصورت تعبیر ہے کہ غیب میں ہم ہیں۔ میں نے اپنے میٹرک کے زمانے میں عربی کی ایک نظم پڑھی تھی' جو ہمارے نصاب میں تھی۔ اس کا بڑا پیارا شعر ہے:

أَغِيبُ وَ ذُو اللَّطَائِفِ لَا يَغِيبُ
وَ أَرْجُوهُ رَجَاءً لَا يَخِيبُ

یعنی مَیں غائب ہو جاتا ہوں' مَیں غافل ہو جاتا ہوں' وہ صاحبِ الطاف (مہربانیاں

فرمانے والا ربّ) تو غائب نہیں ہوتا۔ اور مَیں اُس سے ایسی اُمید باندھے ہوئے ہوں جو ناکام نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ ہے‘ ہر آن موجود ہے۔ وہ تو متوجہ رہتا ہے۔ وہ تو بندے کے انتظار میں رہتا ہے۔ جیسے کہ حدیث میں آتا ہے کہ ہر رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ سمائے دنیا تک نزول فرماتا ہے اور پھر ندا ہوتی ہے:

((هَلْ مِنْ سَائِلٍ يُعْطٰى؟ هَلْ مِنْ دَاعٍ يُسْتَجَابُ لَهُ؟ هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ يُغْفَرُ لَهُ؟))(۱)

’’کیا ہے کوئی مانگنے والا کہ اُسے عطا کیا جائے؟ کیا ہے کوئی دُعا کرنے والا کہ اُس کی دعا قبول کی جائے؟ کیا ہے کوئی بخشش کا طلب گار کہ اُسے بخش دیا جائے؟‘‘

ہم تو مائل بہ کرم ہیں‘ کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے‘ راہروِ منزل ہی نہیں!

اس اعتبار سے اصل میں ہم محجوب ہیں۔ ہم اپنے دھندوں میں لگے ہوئے ہیں‘ دنیا کی دلچسپیوں میں مگن ہیں۔ کچھ حال مست ہیں‘ کچھ مال مست۔ اللہ کی طرف ہم متوجہ ہی نہیں ہوتے۔

اس معنی میں یہ تعبیر بڑی خوبصورت ہے کہ بِالْغَیْب یعنی غیب میں رہتے ہوئے ایمان لانا۔ حقائق اگر سامنے ہوں تو کون ایمان نہیں لائے گا؟ اس میں ایک طرح سے تعریف اور تحسین کا پہلو ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں کہ جو غیب میں ہونے کے باوجود ایمان لائے ہیں۔ اللہ کو دیکھا نہیں لیکن مان رہے ہیں۔ جنت کو دیکھا نہیں لیکن اس کے لیے درخواستیں کر رہے ہیں۔ دوزخ کو دیکھا نہیں لیکن اس سے پناہ طلب کر رہے ہیں۔ تمام چیزوں کو بغیر دیکھے اور غیب میں ہوتے ہوئے مان رہے ہیں۔ یہ گویا کہ تحسین کا ایک کلمہ ہے: ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾۔

اسی بِ ظرفیہ کی کچھ اور مثالیں بھی ہیں۔ سورۃ الملک میں ارشاد ہوا:

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب صلاۃ المسافرین و قصرھا‘ باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل و الاجابۃ فیہ‘ ح:۱۷۷۴۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۲﴾﴾

’’بے شک وہ لوگ جو اپنے ربّ سے ڈرتے ہیں غیب میں رہتے ہوئے‘ اُن کے لیے مغفرت بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی۔‘‘

سورۃ فاطر میں ہے:

﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ﴾ (آیت ۱۸)

’’(اے نبی ﷺ!) آپ تو انہی لوگوں کو خبردار کر سکتے ہیں جو ڈرتے ہیں اپنے ربّ سے غیب میں رہتے ہوئے۔‘‘

(۳) غیب اور تنہائی میں بھی ایمان پر ثبات: اس کا ایک مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ میں منافقین کی طرف بھی ایک طرح کا اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ منافق مسلمانوں کی مجلس میں آ کر تو دعویٰ کرتے تھے کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں‘ مانتے ہیں محمد رسول اللہ ﷺ کو اور قرآن کو‘ لیکن جب وہ غیب میں ہوتے تھے تو اپنی مجلسوں میں جا کر استہزاء کرتے تھے‘ تمسخر کرتے تھے‘ مذاق اڑاتے تھے۔ یہاں گویا کہ ان پر ایک تعریض ہے‘ اور ان الفاظ میں اُن لوگوں کو نمایاں کیا جا رہا ہے جو صرف لوگوں کے سامنے ایمان کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ جب غیب میں ہوتے ہیں‘ غائب ہوتے ہیں‘ تنہائی میں ہوتے ہیں‘ جب ان کو کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا اس وقت بھی ان کا ایمان و یقین برقرار رہتا ہے۔

﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ کے جو تین مفہوم بیان کیے گئے ان کا اعادہ کر لیجیے۔ ایک مفہوم تاویل عام کے اعتبار سے کہ وہ لوگ جو اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ اصل حقائق حواس کی سرحد سے ماوراء ہیں۔ یہ یقین اگر ہے تو ہی درحقیقت قرآن مجید کی ہدایت اپنے آپ کو منکشف (unfold) کرے گی‘ اپنے آپ کو آشکار (reveal) کرے گی اور وہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ تاویل خاص کے اعتبار سے دو مفہوم ہو گئے۔ ایک طرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف اشارہ کہ غیب میں ہوتے ہوئے ایمان رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان حقائق کو انہوں نے دیکھا نہیں لیکن ان کا یقین دیکھی جانے والی چیزوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور ایک اعتبار سے تعریض ہو گئی منافقین پر کہ جو مجلس میں آ کر اہلِ ایمان سے کہتے تو ہیں

کہ ہم ایمان لے آئے‘ لیکن ان کے دل کا حال بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جیسا کہ آگے ہم پڑھیں گے:

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭﴾

’’اور جب یہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان رکھتے ہیں‘ اور جب یہ خلوت میں ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے تو محض مذاق کر رہے ہیں۔‘‘

اس اعتبار سے گویا تعریض کا انداز ہوا۔

نظامِ صلاۃ: حیاتِ مؤمن کا عمود

﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ ’’اور قائم کرتے ہیں نماز‘‘

صلوٰۃ: کسی کی طرف توجّہ‘ عنایت‘ یا کسی کی طرف التفات‘ اس کی طرف اقدام‘ دعا‘ مناجات‘ یہ تمام معانی اس لفظ کے اصل مفہوم میں شامل ہیں۔ البتہ اصطلاح کے طور پر اس کا ترجمہ ’’نماز‘‘ کیا جاتا ہے۔ اَقَامَ یُقِیمُ: کسی چیز کو سیدھا کرنا‘ کھڑا کرنا‘ قائم کرنا۔ مراد کیا ہے؟ نماز کا پورا ایک نظام ہے۔ یہ صرف ایسے ہی نہیں کہ جب جی چاہا (off and on) قیام‘ سجدہ یا مناجات کر لی‘ نہ جی چاہا تو نہ کی۔ دراصل اسے زندگی کے معمولات میں ایک مستقل پروگرام کی حیثیت سے شامل کرنا اور اس کا التزام مطلوب ہے۔ ایسی کیفیت ہو جائے کہ انسان کے شب و روز کے معمولات میں نماز کی حیثیت کھونٹے کی مانند ہو کہ ساری چیزیں اس کے گرد گھوم رہی ہوں اور اسی سے بندھی ہوں۔ کوئی پروگرام ہے‘ ملاقات (appointment) ہے‘ کوئی اور معاملہ ہے تو ان سب کے لیے انسان نماز کے حوالے سے نظام العمل اور نظام الاوقات بنائے کہ زندگی کے اندر نماز ایک عمود اور کھونٹے کی حیثیت اختیار کر جائے۔

﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ میں بھی دونوں امکانات (تاویلِ عام اور تاویلِ خاص) ہیں۔ تاویلِ عام کے اعتبار سے میں حوالہ دے رہا ہوں حضرت لقمان کا۔ ان کی نصائح

میں بھی یہ نصیحت موجود ہے: ﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾ (لقمٰن:۱۷) ’’اے میرے بچے نماز قائم کر۔‘‘ ظاہر ہے یہ نماز وہ نہیں تھی جو ہمیں محمد عربی ﷺ کے ذریعے ملی۔ یہ نماز کا نظام اپنے تمام ارکان کے ساتھ ہے۔ اس کا جزوِ اعظم یہ دعا ہے جو سورۃ الفاتحہ کی صورت میں قرآن مجید میں نازل ہوئی ہے۔ حدیثِ قدسی کے الفاظ ہم پڑھ چکے ہیں: ’’قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ۔‘‘ یہ پنج وقتہ نماز کا نظام‘ اس کے اوقات‘ اس کے ارکان کی ترتیب‘ اس کے قواعد وضوابط‘ یہ پورا نظام محمد عربی ﷺ نے اُمّت کو دیا۔ اس سے قبل اللہ تعالیٰ سے تعلق‘ اپنا ذہنی رابطہ قائم رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی مناجات کا نظام ہمیشہ موجود رہا ہے۔ انسان دنیا کے معمولات و مشغولات میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور اپنے خالق و مالک کو بھول جاتا ہے۔ جب اپنے معمولات میں‘ حوائج میں‘ زندگی کی ضروریات اور مشغولیات میں مصروف ہو جاتا ہے اور اُس کا اپنے ربّ سے ذہنی رابطہ منقطع ہونے کے قریب ہوتا ہے تو ضرورت ہوتی ہے کہ اس کو از سرِ نو اُجاگر کیا جائے۔ اس کے ادراک و شعور کو اپنے قلب و شعور کے اندر زندہ کیا جائے۔ اس کے لیے مجھے حفیظ جالندھری کا یہ شعر بہت پسند ہے ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں‘ لوحِ جبیں تازہ کریں!

یہ نماز درحقیقت اللہ کے ساتھ ہمارے میثاق (covenant) کو از سرِ نو تازہ کرنا‘ اس کی تجدید کرنا ہے۔ ہم دن میں پانچ مرتبہ اپنے میثاق کی‘ قول و قرار اور معاہدے کی تجدید کرتے ہیں۔

تاویلِ خاص کے اعتبار سے اس سے نماز کا پنج وقتہ نظام مراد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُمّت کو یہ نظام پہلے ہی دے دیا تھا۔ صلاۃِ پنج گانہ کا نظام مکّی دور میں آ چکا تھا‘ اس لیے کہ یہ شبِ معراج میں تفصیل کے ساتھ حضور ﷺ کو عطا کیا گیا۔ اس کے بعد سے اقامتِ صلاۃ مکّی دَور ہی میں شروع ہو چکی تھی۔ گویا نظامِ صلاۃ ان آیات کے نزول کے وقت موجود تھا۔

اِنفاق فی سبیل اللہ

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳﴾

''اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

نَفَقَ یَنْفُقُ کے معنی ہیں خرچ ہو جانا' ختم ہوجانا۔ نَفَقتِ الدَّرَاھِمُ: ''پیسے ختم ہو گئے یا خرچ ہو چکے۔'' بابِ افعال سے ''اِنفاق'' کے معنی ہوں گے کھپانا' خرچ کرنا' لگانا' صَرف کر دینا۔ خرچ تو انسان کرتا ہی ہے۔ خسیس اور بخیل لوگ جو سینت سینت کر رکھتے ہیں' ان کو یہاں خارج کر دیجیے۔ چنانچہ ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳﴾ سے وہ لوگ نکل گئے۔ پھر خرچ کرنے میں بھی ایک ہے اپنی عیش پر خرچ کرنا' اپنی عیاشی' اپنے اسراف اور تبذیر میں یعنی زائد از ضرورت یا بلاضرورت خرچ کرنا۔ یا پھر اپنی ہی ضروریات پر خرچ کرنا جو ہر انسان کرتا ہے۔ یہ چیزیں بھی یہاں سے خارج ہو جائیں گی۔ اس لیے کہ یہاں اِنفاق کا ذکر مقامِ مدح میں ہو رہا ہے۔ اگرچہ الفاظ موجود نہیں مگر مراد ہے ''فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ'' یا ''فِیْ مَرْضَاتِ اللّٰہِ'' یعنی اللہ کی راہ میں یا اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرنا۔

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳﴾ ''اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (اللہ کی رضا کے لیے)۔'' قرآن مجید میں اللہ کی رضا جوئی میں خرچ کرنے کے لیے جو الفاظ آتے ہیں ان میں زکوٰۃ بھی ہے' صدقات بھی ہیں' انفاق بھی ہے' ایتائے مال بھی ہے۔ ان میں سب سے جامع اصطلاح ''اِنفاق'' ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر خاص طور پر انفاق کے موضوع پر پورے دو رکوع آئیں گے اور یہ اصطلاح بہت ہی شرح و بسط کے ساتھ پوری طرح اُجاگر ہو کر' نکھر کر سامنے آئے گی۔ اس میں زیادہ نمایاں پہلو ہوتا ہے دین کے لیے خرچ کرنا' جیسا کہ ہمارے سامنے حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کی مثال ہے۔ آپؓ خاصے بڑے سرمایہ دار' تاجر تھے' لیکن اپنا سارا سرمایہ خرچ کر دیا' لگا دیا۔ خاص طور پر غلاموں کے طبقات میں سے جو لوگ ایمان لائے

تھے ان کے آقاؤں کو منہ مانگے دام دے کر' بڑی بھاری رقمیں دے کر ان کو خریدا اور آزاد کر دیا۔ ان میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ سرِفہرست ہیں۔ چنانچہ یہ ان کا انفاق ہے۔

یہ تاویل خاص کے اعتبار سے اللہ کی رضا کی خاطر دل کھول کر خرچ کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک علامت' ایک وصف اور ایک نمایاں خصوصیت بیان ہو رہی ہے۔ تاویل عام میں یہاں پر بخیل لوگ بھی نکل جائیں گے اور وہ لوگ بھی جو تبذیر یا اسراف کے طور پر پیسہ لٹاتے ہوں یا اپنے ہی لیے اور اپنی ہی ضروریات پر خرچ کرتے ہوں۔ درحقیقت وہ لوگ مراد ہوں گے جو خیر کے لیے' بھلائی کے لیے' نیکی کے لیے' غرباء' محتاجوں اور مساکین کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ یہ بھی درحقیقت فطرت کی صحت و سلامتی کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔ نیکی اور تقویٰ کا ایک رخ جہاں شکر ہے وہاں دوسرا رُخ رحم ہے کہ انسان بھوکے کو دیکھ کر تڑپ اُٹھے اور اس کو کھانا کھلائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بار بار آیا ہے: ﴿وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳﴾ (الماعون) ''اور مسکین کو کھانا کھلانے کی تلقین نہیں کرتا۔'' گویا کسی شخص کی دنائت' پستی اور فطرت کے مسخ ہو جانے کی ایک بہت بڑی علامت یہ ہے کہ خود بھی بخیل ہے' کسی بھوکے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر تیار نہیں اور کسی اور کو بھی کہنے کو آمادہ نہیں' اس لیے کہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میں کسی سے کہوں گا تو وہ پلٹ کر مجھے کہہ دے گا کہ تم بھی تو پیسے والے ہو' تم کیوں نہیں خرچ کرتے! یہ گویا اخلاقی پستی کی انتہا کے لیے تعبیر ہے جو ان الفاظ کے ذریعے سے کی گئی ہے: ﴿وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳﴾ اس کے برعکس یہ ہے کہ ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳﴾ ''جو کچھ ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

رزق اگرچہ عام طور پر کھانے پینے کی چیزوں کے لیے مستعمل ہے لیکن حقیقت میں رزق اور نصیب وسیع مفہوم رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ رزق ہے۔ کسی کو ذہانت ملی ہے تو یہ بھی اللہ کا رزق ہے' جو اُس نے اپنے بندے کو دیا ہے۔ کسی کو دوسرے لوگوں سے امتیازی حیثیت میں اللہ تعالیٰ نے کوئی خصوصیت یا خاص صفت عطا

کی ہے تو یہ بھی اُس کا رزق ہے۔ اسی طرح علم‘ اولاد‘ صحت‘ مال اور دنیاوی اسباب سب رزق ہیں۔

وحیٔ الٰہی اور آخرت کے ماننے والے

آیت ۴ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ

’’اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اس پر بھی جو نازل کیا گیا (اے محمد ﷺ!) آپ کی طرف اور جو نازل کیا گیا آپ سے پہلے۔‘‘

يُؤْمِنُوْنَ بِمَا میں ’’بِ‘‘ صلہ (preposition) ہے۔ اس میں بھی تاویل خاص کے اعتبار سے ایک تعریض ہے۔ وہ یہ کہ یہود صرف اپنے اوپر نازل ہونے والی کتاب کو‘ صحیفوں کو اور تورات کو مانتے تھے۔ ’’عہد نامہ قدیم‘‘ (Old Testament) صرف ’’تورات‘‘ پر مشتمل نہیں ہے‘ بلکہ اس کی پہلی پانچ کتابیں خواہ تحریف شدہ صورت میں ہیں‘ تورات ہیں۔ اس کے بعد بہت سے انبیاء کے صحیفے ہیں۔ چنانچہ یہودی ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ سے خارج تو ہیں ہی‘ ﴿مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ سے بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ وہ تو انجیل کو بھی نہیں مانتے۔ مدینہ میں نصاریٰ ویسے ہی موجود نہیں تھے۔ وہ لوگ جو مدینہ میں تھے (یعنی یہودی) وہ یہ کہتے تھے کہ ہم اور کسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بس ہمارے پاس جو بھی کتاب ہے‘ جو بھی اللہ کی طرف سے وقتاً فوقتاً وحی آئی ہے ہم اس کو مانتے ہیں۔ تو یہ ان پر تعریض ہے۔ گویا ان پر تنقید کی جا رہی ہے اور اس کے مقابلے میں محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں کی جانب اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ان میں وسعتِ قلب ہے‘ وسعتِ نظر ہے۔ وہ کسی تنگ نظری میں مبتلا نہیں ہیں‘ بلکہ وہ حق کے جویا ہیں۔ حق جہاں بھی ہے‘ اس کو مانتے ہیں۔ اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اے نبی ﷺ آپ کی طرف نازل کیا جا رہا ہے یا نازل کیا جا چکا ہے اور اس پر بھی جو آپؐ سے پہلے نازل کیا گیا۔

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ④ ’’اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔‘‘

آخِر: پچھلا‘ اس کا مؤنث آخرۃ: کوئی پچھلی چیز۔ یہ ایک وصف ہے‘ ایک صفت ہے‘ لیکن اس سے پہلے گویا محذوف مانا جائے گا: الحیاۃ الآخرۃ (پچھلی زندگی)‘ یا الدار الآخرۃ: (پچھلا گھر)‘ یا العالَم الآخرۃ (عالَمِ آخرت‘ پچھلا عالَم) یا النشأۃ الآخرۃ (پچھلا اٹھایا جانا)۔ ایک نشأۃِ اولیٰ ہے: ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ⑫﴾ (الواقعۃ) ’’اور تم (اپنی) پہلی زندگی کے بارے میں تو جانتے ہی ہو‘ تو پھر تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟‘‘ اللہ تعالیٰ نے پہلی مرتبہ جو تمہیں اٹھایا تو آخر دوبارہ اٹھانا اُس کے لیے کیسے ناممکن ہو جائے گا؟ چنانچہ کوئی نہ کوئی لفظ یہاں (اس کے موصوف کے طور پر) محذوف ماننا پڑے گا۔ ویسے قرآن مجید میں یہ لفظ (الآخِرَۃ) بغیر کسی موصوف کے اس کثرت کے ساتھ آیا ہے کہ اس سے مراد اُخروی زندگی ہی ہے۔ جیسے: ﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ⑰﴾ (الاعلیٰ) ’’جب کہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی۔‘‘ کہیں کہیں موصوف کو نمایاں کر دیا گیا ہے لیکن اکثر و بیشتر محض ’’آخِرۃ‘‘ ہی آیا ہے۔

ایقان‘ ایمان سے برتر!

یہاں یہ نوٹ کیجیے کہ اب تک لفظ ’’يُؤْمِنُوْنَ‘‘ چلا آ رہا تھا لیکن یہاں لفظ ’’يُوْقِنُوْنَ‘‘ آیا ہے کہ ’’آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں‘‘۔ ’’ایقان‘‘ درحقیقت ’’ایمان‘‘ سے بڑھ کر ایک کیفیت ہے۔ گویا عمل کے اعتبار سے اہم ترین ایمان بالآخرۃ ہے۔ اگر آخرت کا یقین ہو گا تو انسان کا عمل درست ہو گا۔ البتہ نظری‘ اصولی‘ فکری و عملی اعتبار سے اصل ایمان ہے: ایمان باللہ۔ ایمان بالرسالت اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت پر ایمان کی توسیع (extention) ہے۔ اسی طرح ’’آخرت‘‘ اللہ تعالیٰ کے جزا و سزا کا یقین ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا ظہور ہے۔ اس اعتبار سے ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ ایمان باللہ کی فروع (شاخیں) ہیں۔

قانونی اعتبار سے اہم ترین ایمان ہے: ایمان بالرسالت۔ یہ بات آگے چل کر دوسرے رکوع میں واضح ہو گی‘ جہاں پر درحقیقت منافقوں اور یہودیوں کے ضمن میں پانی مرتا تھا کہ وہ حضور ﷺ کو ماننے کو تیار نہیں تھے‘ جبکہ اللہ کو ماننے کا اقرار بھی کرتے

تھے اور آخرت کو ماننے کا بھی اقرار کرتے تھے۔ فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸﴾

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر بھی اور یومِ آخر پر بھی' مگر وہ حقیقت میں مؤمن نہیں ہیں۔''

وہاں ایمان بالرسول کی کمی یا نفی تھی جبکہ قانونی اعتبار سے اہم ترین ایمان' ایمان بالرسول ہے۔ رسول ﷺ کو مانیں گے تبھی یہ معلوم ہوگا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو کن اَسماء وصفات کے حوالے سے ماننا ہے: آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ ۔ اسی طرح جب رسول ﷺ کو مانیں گے تو معلوم ہوگا کہ آخرت کی تفاصیل کیا ہیں۔ بعث بعد الموت' حساب کتاب' جزا وسزا' وزنِ اعمال' جنت اور دوزخ سب کو ماننا ہوگا۔ قانونی اعتبار سے کوئی شخص خواہ کتنا ہی موحدِ اعظم ہو اگر وہ رسول اللہ ﷺ کو نہیں مانتا تو کافر شمار ہوگا۔ اسی طرح کوئی شخص کتنا ہی آخرت کو مانتا ہو مگر رسول اللہ ﷺ کو نہیں مانتا تو وہ کافر قرار پائے گا۔

قانونی اعتبار سے اصل ایمان ''ایمان بالرسول'' ہے اور عملی اعتبار سے یعنی انسان کے اپنے عمل اور اخلاق کی درستگی کے اعتبار سے اہم ترین ایمان ''ایمان بالآخرۃ'' ہے۔ انسان کا عمل تبھی درست ہوگا جب جزا وسزا کا یقین ہو' بعث بعد الموت کا یقین ہو کہ مرنے کے بعد جی اُٹھنا ہے' ہر عمل کی جواب دہی کرنی ہے اور ہر عمل وزن میں آئے گا۔ جیسے کہ سورۃ الکہف میں فرمایا گیا:

﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ﴾

(آیت ۴۹)

''اور رکھ دیا جائے گا اَعمال نامہ' چنانچہ تم دیکھو گے مجرموں کو کہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو کچھ اس میں ہوگا اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ کیسا

اَعمال نامہ ہے؟ اس نے تو نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو' مگر اس کو محفوظ کر رکھا ہے۔''

اگر یہ یقین ہے تو آدمی تیر کی طرح سیدھا ہو جائے گا اور اس کا ہر عمل صحیح ہوگا۔ وہ زبان سے کوئی بھی لفظ نکالنے سے پہلے تولے گا کہ مجھے یہ لفظ کہنے کا حق ہے کہ نہیں! اگر یہ یقین نہیں ہے تو بے پروائی' لاابالی پن اور غیر ذمہ دارانہ رویّہ اختیار کرے گا۔ جو چاہے گا کہے گا' جو چاہے گا کرے گا۔

''يُؤْمِنُوْنَ'' کے بجائے ''يُوْقِنُوْنَ'' میں ایمان کی گہرائی اور یقین کی کیفیت زیادہ ہے۔ ایک ایمان باللّسان بھی ہے یعنی ایمان کا زبانی اظہار' اور ایک حقیقی ایمان ہے یعنی یقین بالقلب کی کیفیت: ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

یہاں آخرت کے ساتھ لفظ یقین آیا ہے: ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴﴾ ''اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔'' اگر اس کو عام عربی زبان کے انداز میں تحریر (paraphrase) کیا جائے تو جملہ ہونا چاہیے: وَهُمْ يُوْقِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لیکن یہاں فرمایا: ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴﴾ اس میں ایک تو تاکید (emphasis) ہے کہ آخرت پر تو ان کا یقین ہے۔ پھر عام عربی میں یہاں پر هُمْ کی ضرورت نہیں ہے۔ ''يُوْقِنُوْنَ'' فعل ہے جس میں فاعل از خود (ضمیر فاعلی کی صورت میں) موجود ہے' لیکن ''هُمْ'' کو مزید تکرار کے طور پر لایا گیا' پھر اس کو مقدّم کیا گیا اس اعتبار سے کہ اور زیادہ emphasis ہو جائے: ''آخرت پر تو ان کا یقین ہے۔'' بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ''آخرت پر تو ان ہی کا یقین ہے۔'' هُمْ لانے سے حصر کا انداز پیدا ہوا۔ اس میں بھی تعریض ہوگئی کہ کہنے کو تو کچھ اور لوگ بھی کہتے ہیں کہ ہم آخرت کو بھی مانتے ہیں' جیسے آگے چل کر یہود یا منافقین کا قول آجائے گا' لیکن یہ کہ حقیقتاً آخرت کا یقین صرف انہی لوگوں کا ہے جن میں یہ اوصاف موجود ہیں۔

تاویلِ عام کے اعتبار سے غور کریں تو آخرت کا ایمان اور یقین اس اجمالی ایمان کا جزوِ لازم ہے جو ہم سورۃ الفاتحہ کے مطالعے میں دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک سلیم الفطرت‘ صحیح العقل انسان کی رسائی ہو جاتی ہے‘ اس کا ایک جزوِ لازم یہ بھی ہے: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۝﴾ کہ اللہ ہی جزا و سزا کے دن کا مالک ہے۔ اگر یہاں تک رسائی نہیں ہو گی تو پھر ایمان باللہ‘ حمد و شکر اور اللہ تعالیٰ کو رحمٰن و رحیم ماننا یہ سب شاید ذہنی عیاشی بن کر رہ جائے۔ اصل میں جو چیز انسان کو سیدھا کرنے والی ہے‘ اُس کے عمل‘ اس کے اخلاق‘ اس کے معاملات اور اُس کی روِش کو درست کرنے والی ہے وہ آخرت کا یقین ہے۔

ہدایت یافتہ گروہ

اس کے بعد فرمایا:

آیت ۵ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ

’’یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے ربّ کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔‘‘

یہاں ان آیات کی تاویل خاص نکھر کر آ گئی۔ اُولٰٓئِكَ دیکھو‘ وہ لوگ ہیں‘ ابوبکرؓ‘ عمرؓ‘ عثمانؓ‘ علیؓ‘ طلحہؓ‘ زبیرؓ۔ حضور اکرم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو انصار میں سے بھی بہت سے لوگ ایمان لا چکے تھے۔ ۷۲ تو وہ تھے جنہوں نے بیعتِ عقبہ ثانیہ میں حصہ لیا اور حضور اکرم ﷺ کو دعوت دی کہ آپ ﷺ مدینہ تشریف لائیے۔ سعد بن عبادہؓ اور سعد بن معاذؓ جیسے لوگ بھی موجود تھے۔ تو یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے ربّ کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ گویا ان آیات کا ابتدائی حصہ تاویل عام کی طرف زیادہ اشارہ کر رہا ہے کہ قرآن مجید کی ہدایت سے استفادے کی یہ شرائط ہیں‘ جبکہ ان آیات کا اختتام تاویل خاص کی طرف زیادہ اشارہ کر رہا ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ جو اس شجرۂ مبارکہ کے برگ و بار ہیں۔ درخت کو اگر پھل سے پہچانتے ہو تو ان کو دیکھ لو‘ ان کے نمایاں اوصاف تمہارے سامنے ہیں۔ ان کے معمولات نماز کے گرد گھوم رہے ہیں۔ نماز ہی ان کی زندگی کا مرکز و محور بن چکی ہے۔ آخرت پر ان کے یقین کا مشاہدہ ان کی زندگیوں میں کر لو۔ ان کا ایمان دیکھ لو۔ کوئی تنگ ظرفی نہیں ہے کہ ہم تو صرف اسی کو مانیں گے جو ہمارے لیے

نازل کیا گیا‘ بلکہ جو بھی اللہ نے اس سے پہلے اتارا ہے اس پر بھی ان کا ایمان ہے۔ ان کی نگاہ وسیع‘ ان کا سینہ کشادہ ہے۔ ان کے نقطۂ نظر (approach) کے اندر کوئی تنگی نہیں ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے ربّ کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور ہدایتِ قرآنی کا مظہر اور ثبوت ہیں۔ یہ اس کی برکات کا ظہور ہیں۔ ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ﴾ ’’یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔‘‘

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝۵

’’اور یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔‘‘

یہاں پر پھر هُمْ لا کر گویا حصر کا اسلوب لایا جا رہا ہے۔ مُفْلِحُون: فلاح پانے والے۔ فَلَحَ يَفْلَحُ (ف) فَلْحًا کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو کاٹنا‘ توڑنا‘ چیرنا‘ پھاڑنا‘ زمین میں ہل چلانا۔ اسی سے لفظ فَلَّاح بنا ہے‘ یعنی ہل چلانے والا۔ کسان اپنے ہل کی نوک سے زمین کے سینے کو چیرتا ہے۔ مصر میں فَلَّاحین کی تحریک تھی‘ جیسے ہمارے ہاں کسان موومنٹ یا کسانوں کی تحریک۔ تو فلّاح، فَلَحَ سے بنا ہے۔ اسی سے محاورہ ہے: اِنَّ الْحَدِيْدَ بِالْحَدِيْدِ يُفْلَحُ: لوہا‘ لوہے سے ہی کٹتا ہے۔ فَلَحَ کے علاوہ فعل فَلِحَ يَفْلَحُ (س) بھی آتا ہے‘ یعنی خود ٹوٹ جانا‘ پھٹ جانا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: فَلِحَتْ شَفَتُهُ کہ اُس کے ہونٹ پھٹ گئے۔ باب افعال میں اَفْلَحَ يُفْلِحُ فَلَاحًا (مصدر کے طور پر یہاں بھی لفظ فَلَاح ہی استعمال ہوتا ہے بجائے اِفْلَاح کے) کا مفہوم بھی وہی ہے جو فَلَحَ يَفْلَحُ کا ہے یعنی پھاڑنا‘ لیکن اس میں مبالغہ اور تاکید ہے‘ زور اور شدّت ہے کہ کسی شے کو پوری طاقت کے ساتھ پھاڑنا اور اس میں سے کوئی شے برآمد کرنا۔ جیسے زمین کو کھود کر مدفون خزانے کو نکال لینا۔ کسی چیز کے اوپر crust آ گیا ہے‘ پپڑی جم گئی ہے‘ کسی اعتبار سے کوئی پردہ آ گیا ہے تو اُسے ہٹا کر اُس چیز کو منکشف کرنا۔ پپڑی جم گئی ہے تو اسے توڑ کر اس میں اصل شے کو باہر نکال لینا۔

یہ اَفْلَحَ کا اصل مفہوم ہے اور یہ لفظ قرآن مجید کی بڑی بنیادی اصطلاح ہے۔ دوسرے مذاہب میں زیادہ تر لفظ ’’نجات‘‘ آتا ہے۔ ویسے نجات کا لفظ قرآن مجید میں

بھی آیا ہے۔ سورۃ المؤمن میں مؤمنِ آلِ فرعون کی تقریر کے الفاظ نقل ہوئے ہیں:

﴿وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ﴿٤١﴾﴾

''اور اے میری قوم! مجھے کیا ہوا کہ مَیں تمہیں بلاتا ہوں نجات کی طرف اور تم مجھے بلاتے ہو دوزخ کی طرف!''

اسی طرح انسان کا کسی حیثیت سے بچ جانا اور کامیاب ہو جانا' اس کے لیے فَائِزُوْنَ، رَاشِدُوْنَ وغیرہ مختلف الفاظ آئے ہیں' لیکن سب سے زیادہ کثرت کے ساتھ اور انسان کی سب سے اونچی منزلِ مقصود کی تعبیر کے لیے لفظ فلاح آیا ہے۔ اس کی اصل حقیقت سمجھ لیجیے۔

فلاح اور انسان کا روحانی و باطنی وجود

انسان وجودِ مرکب کا حامل ہے۔ اس کی ایک باطنی حقیقت ہے' ایک روحانی وجود ہے جو اصل انسان ہے۔ اس کے گرد ایک مادی غلاف یا مادی خول ہے جس کے اندر انسان کی اصل حقیقت لپٹی ہوئی ہے۔ انسان سے مطلوب یہ ہے کہ اس مادی غلاف کو توڑ پھوڑ کر اس میں سے اپنی انا کو' اپنی خودی کو برآمد کرے۔ اپنے روحانی وجود کو پروان چڑھائے' جیسے کہ گٹھلی پھٹتی ہے' اس میں سے پتیاں نکلتی ہیں اور پودا پروان چڑھتا ہے۔ یہ مادی غلاف ہمیں ہماری اصل حقیقت سے غافل اور بے خبر رکھتا ہے' جیسے کہ سورۃ الحشر میں ارشاد ہوا:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ﴾ (آیت ۱۹)

''اور (اے مسلمانو دیکھنا!) تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

ہم یہی سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ہمارا اصل وجود یہی جسمانی وجود ہے جس کے کچھ تقاضے اور ضرورتیں ہیں' اور پھر ہم انہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ جسم کو کوئی عارضہ لاحق ہو جائے تو ہم بے چین ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے درد محسوس ہوتا ہے جبکہ روح کی کوئی فکر نہیں۔ اس کی غذا کا کوئی اہتمام نہیں۔ اس کو تر و تازہ رکھنے کی کوئی کوشش نہیں۔ روح بیمار ہو' پژمردہ ہو'

مضمحل ہو تو ہمیں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ اس کے لیے کوئی بھاگ دوڑ نہیں ہوتی۔ علاج معالجے کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اپنشد کا بڑا پیارا جملہ ہے:

" Man, in his ignorance, identifies himself with the material sheaths that encompass his real self."

یعنی انسان اپنی جہالت اور نادانی میں اپنے آپ کو ان مادی غلافوں سے تعبیر کر بیٹھتا ہے کہ جو اس کی اصل اَنا اور خودی کے گرد لپٹے ہوئے ہیں۔ اپنے مادی خول ہی کو وہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ میں یہ ہوں' میرا یہ جسم ہے' حالانکہ اس کی اصل خودی اور اَنا وہ روحانی وجود ہے جو اس کے اندر مضمر ہے۔ اس کو پروان چڑھانا مطلوب ہے۔ یہ ریاضتیں' مشقتیں' تپسیائیں جو مختلف لوگ کرتے رہے ہیں' یہ سب اپنے مادی خول کو توڑ کر اس روحانی وجود کو برآمد کرنے کے لیے تھیں۔

قرآن مجید نے بھی ہمیں اس مقصد کے لیے کچھ مشقتیں اور ریاضتیں دی ہیں' جن میں سے ایک شکل نماز کی ہے۔ نماز ایک ریاضت ہے' ایک مشقت ہے۔ دنیاوی دلچسپیوں کو چھوڑ کر اپنا وقت نکال کر ہم اللہ تعالیٰ سے لَو لگاتے ہیں' اپنے میثاق کو تازہ کرتے ہیں۔ اسی طریقے سے روزہ ہے۔ یہ بھی مادی وجود کے تقاضوں کو روکنے' ان کو دبانے اور suppress کرنے کے لیے ہے تاکہ اصل روحانی وجود تقویت پائے۔ پھر انفاق ہے' زکوٰۃ و صدقات ہیں کہ مال کی محبت سے اپنے آپ کو روکا جائے۔ مال کی محبت کے خول کو توڑنے کے لیے اسے خرچ کرنے اور زکوٰۃ و صدقات کی تعلیم دی گئی۔ جہاد و قتال اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال لگانا ہے' صَرف کرنا ہے۔ یہ سب درحقیقت ریاضتیں ہیں جن کے ذریعے سے اصل میں خودی کی نشوونما مطلوب ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اپنی کتاب ''حکمتِ اقبال'' میں خودی کا تصوّر بڑی خوب صورتی سے اُجاگر کیا ہے۔ اگرچہ مصنف کی ہر بات سے تو کوئی اتفاق نہیں کر سکتا لیکن انہوں نے واضح کیا ہے کہ خودی ہی انسان کی اصل حقیقت ہے۔ علامہ اقبال کا فلسفۂ خودی ویسے تو چیستان بن گیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے جس طرح اسے سمجھا ہے اور سمجھایا ہے' شاید کسی اور نے اس طور سے نہ سمجھا ہے اور نہ سمجھایا ہے'

چاہے وہ کتنا ہی علامہ اقبال کا نام لیوا رہا ہو۔ اقبال کے نزدیک ہماری اصل حقیقت ہمارا مادی وجود نہیں بلکہ ہماری خودی ہے۔ ''خودی'' فارسی کا لفظ ہے' عربی میں اسے اَنا کہیں گے اور انگریزی میں self اور ego۔ ''اَسرارِ خودی'' (Secrets of the Self) علامہ اقبال کی شہرۂ آفاق مثنوی ہے۔ درحقیقت قرآن مجید کی رُو سے ہماری روح جو ہم میں پھونکی گئی وہ ہمارا روحانی وجود ہے جو ایک مستقل وجود ہے لیکن ہمارا مادی وجود اس پر غالب ہے' چھایا ہوا ہے۔ وہ اس کے اندر دبی ہوئی ہے' سسک رہی ہے' اسے پروان چڑھانا اصل فلاح ہے۔ آخرت میں اس کا ظہور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام واکرام اور اعزاز کی صورت میں ہوگا وہ گویا اس کا نتیجہ ہے۔ اصل فلاح تو انسان یہاں حاصل کرتا ہے۔ اگر وہ اپنے روحانی تقاضوں کو اپنے حیوانی وجود سے برآمد کر کے' حیوانی وجود کو دبا کر اپنے روحانی وجود کو پروان چڑھاتا ہے تو یہ ہے فلاح۔ گویا اصل کامیابی!

ذاتی عصبیت اور ہٹ دھرمی میں مبتلا گروہ

آیت ۶ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾

اگلی دو آیات میں تاویلِ خاص کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ تاویلِ عام کے اعتبار سے اس کا مفہوم بعد میں بیان کردوں گا۔ یہاں اصل اشارہ مشرکینِ مکّہ کی طرف ہو رہا ہے' خاص طور پر سردارانِ قریش جو ۱۳ برس تک رسول اللہ ﷺ کی دعوت سنتے رہے لیکن ایمان نہیں لائے۔ ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جن کے دل نے گواہی بھی دی کہ یہ دعوتِ حق ہے' صحیح بات یہی ہے' محمد (ﷺ) جھوٹے نہیں ہیں' دھوکے باز نہیں ہیں۔ ان سے بڑھ کر یہ حقیقت کس کو معلوم تھی! اور پھر یہ کہ یہ کلام انسانی نہیں ہے۔ انہیں واقعتاً ماننا پڑا کہ یہ انسانی کلام نہیں۔ انسان کے اندر یہ طاقت نہیں ہے کہ ایسا کلام موزوں کر سکے۔ اس اعتبار سے حقیقت منکشف ہو چکنے کے باوجود وہ عناد' تعصب' ہٹ دھرمی' حسد اور تکبر کی بنا پر کفر پر اڑ گئے۔ چنانچہ یہ دوسری جماعت ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ پہلا گروہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا جنہوں نے قرآن مجید کی ہدایت سے استفادہ کیا اور

ان کی شخصیتیں ہدایتِ قرآنی کا ایک مرقع ہیں۔ دوسرا گروہ ہٹ دھرم کافروں کا تھا جن کا تذکرہ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾ کے الفاظ سے کیا جا رہا ہے۔

یہاں کفر کو انتہائی معنی میں لیجیے۔ کفر کا اصل مفہوم تو کسی چیز کو چھپا دینا' دبا دینا ہے۔ انسان کے اندر کسی شے کے بارے میں یہ گواہی اُبھرے' دل گواہی دے دے کہ یہ بات صحیح ہے لیکن کسی مصلحت کی وجہ سے وہ اس کو نہ مانے' یہ کفر ہے۔ اسی طریقے سے کسی کے احسان کے جواب میں جذبہ شکر اُبھرا لیکن کسی وجہ سے انسان اس کو دباتا ہے' ظاہر نہیں کرتا' زبان سے شکر ادا نہیں کرتا' یہ بھی کفر ہے۔ کفر شکر کے مقابلے میں بھی آتا ہے' اس لیے کہ شکر فطرتِ انسانی کا جذبہ ہے جسے انسان نے دبا دیا' چھپا لیا۔ کفر کسی بات کا بھی ہوتا ہے بایں معنی دل نے تو مانا کہ یہ بات صحیح ہے لیکن یہ سوچنا کہ اگر میں اسے مان لوں گا تو یہ جیت گیا' میں ہار گیا۔ یہ بازی لے گیا اور میں بازی ہار گیا۔ یا اس کی فوقیت ثابت ہو جائے گی اور میں تو کمتر درجے کا ثابت ہو جاؤں گا۔ اس وجہ سے کسی شے کی حقانیت کے انکشاف کے بعد بھی اس کو رَدّ کر دینا' یہ کفر ہے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کی طرف سے کسی عصبیت کی وجہ سے کوئی کفر ہوا ہو۔ اگر وہ عصبیت قومی ہو کہ ہمارے آباء واَجداد کا ایک دین تھا' یہ ان کے عقائد تھے' یہ رسوم ورواج ہمارے ہاں صدیوں سے چلے آ رہے ہیں' یہ ہماری ریت ہے' ہم کیسے چھوڑ دیں! تو ہو سکتا ہے کہ یہ تعصب کچھ وقت کے بعد زائل ہو جائے۔ اگر حقانیت کا انکشاف زیادہ واضح طور پر ہو جائے تو یہ آبائی عصبیت ختم ہو سکتی ہے' لیکن ذاتی عصبیت' اپنا تکبر' اپنی ضد زائل نہیں ہو سکتی۔ اسے قرآن مجید نے شِقاق کہا ہے: ﴿ہُمۡ فِیۡ شِقَاقٍۭ﴾ (البقرۃ:۱۳۷) یعنی ضِدم ضِدّا کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ تکبر' حسد' بغض' عناد' شقاق کی بنا پر جب کوئی کفر پر اڑ چکا ہو تو اب اس کے حق میں کوئی اِنذار' کوئی افہام وتفہیم' کوئی بات سمجھانا' دلائل سے قائل کرنا سب بے سود اور بیکار ہے۔ یہ خاص گروہ ایسے عنادی کافروں کا ہے جس کا یہاں تذکرہ ہو رہا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ عام معنی میں نہیں ہے' اس لیے کہ بے شمار لوگ اس کے بعد بھی ایمان لے آئے۔ مکہ میں بھی ایسے لوگ تھے جو

بعد میں ایمان لائے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے ابتداءً انکار کیا‘ جیسے کہ عمر بن الخطاب‘ تاہم ان کا انکار و اعراض آبائی تعصب یا عصبیت کی بنیاد پر تھا۔ آباء و اَجداد کے طور طریقوں کے ساتھ ایک عصبیت تھی۔ البتہ ابوجہل کا معاملہ ذاتی عناد‘ حسد اور تکبر کا تھا‘ اس وجہ سے وہ ڈھل نہیں سکا۔ حضرت عمر بن الخطاب ؓ کو اگرچہ چھ سال لگ گئے لیکن پھر اسلام کی آغوش میں آ گئے۔ حضرت حمزہ ؓ میں عصبیت نہیں تھی‘ بس غفلت اور بے پروائی تھی۔ کھیل کود اور دیگر مشاغل میں دلچسپی زیادہ تھی۔ ہفتوں صحرا اور جنگلوں میں شکار کے اندر مصروف رہتے۔ اس طرف توجہ ہی نہیں تھی کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کیا دعوت لے کر کھڑے ہوئے ہیں! محض غفلت کی بنا پر یا آبائی رسوم و رواج کی وجہ سے تعصب اور عصبیت کی بنا پر آیا ہوا زنگ ڈھل سکتا ہے‘ لیکن جہاں ذاتی تکبر‘ عناد‘ شقاق اور ضِدم ضِدّا کی کیفیت ہو تو یہ شے زائل ہونے والی نہیں ہے۔ یہ معاملہ مکّہ میں تو سردارانِ قریش کا تھا یا پھر مدینہ میں علمائے یہود کا۔ اس لیے اکثر مفسّرین کی رائے یہ ہے کہ ان دو آیات (۶‘۷) میں اِن ہی دونوں گروہوں کی طرف اشارہ ہے۔ مکّہ کے زعماء اور سردارانِ قریش جبکہ مدینہ میں یہود کے علماء اور مذہبی پیشوا‘ ان کی طرف روئے سخن ہے۔ تو فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝۶﴾

’’یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا (یعنی وہ لوگ کہ جو کفر پر اَڑ گئے) ان کے لیے برابر ہے (اے محمد ﷺ) کہ آپ انہیں انذار فرمائیں یا نہ فرمائیں‘ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔‘‘

یقیناً وہ لوگ جو کفر پر اَڑ چکے ہیں‘ کفر پر جم چکے ہیں‘ ضد کی بنا پر کفر پر راسخ ہو گئے ہیں‘ ان کے حق میں برابر ہے‘ خواہ آپ انہیں خبردار کریں یا نہ کریں! عَلٰی حرفِ جار اکثر مخالفت کے لیے آتا ہے لیکن حروفِ جار کے استعمال میں بعض اوقات ادل بدل بھی ہو جاتا ہے۔ عَلٰی کی جگہ لام اور لام کی جگہ عَلٰی آ سکتا ہے۔ اگرچہ یہاں پر عَلٰی آیا ہے ﴿سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ﴾ ’’ان پر برابر ہے‘‘ لیکن یہاں مراد ہے ’’سَوَآءٌ لَّہُمۡ‘‘ یعنی ان کے

حق میں برابر ہے۔ ﴿ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ﴾ ’’خواہ آپؐ انہیں انذار کریں یا انذار نہ کریں۔‘‘

ہمارے ہاں عام طور پر لفظ انذار کا ترجمہ ڈرانا کر دیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اس کا لفظی ترجمہ خبردار کرنا (to warn) ہے۔ نذیر کے معنی ہیں: خبردار کرنے والا (warner)‘ آگاہ کر دینے والا۔ اگر آگے گڑھا ہے اور کوئی نابینا شخص جا رہا ہے اور آپ اسے پکار کر کہتے ہیں کہ دیکھنا بھائی آگے گڑھا ہے تو یہ درحقیقت انذار ہے‘ تخویف نہیں ہے۔ چنانچہ عنادی کافروں کے بارے میں ارشاد ہوا کہ اے نبی ﷺ! آپ کتنا ہی انہیں خبردار کریں‘ آخرت کی خبر سنائیں‘ جہنم کی وعیدیں سنائیں‘ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اب ان کے حق میں بالکل برابر ہے خواہ آپؐ انہیں خبردار کریں یا نہ کریں۔

آیت ۷ ﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِہِمۡ ؕ﴾

’’مہر کر دی ہے اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر۔

’’ختم‘‘ کا لفظ اردو میں جس معنی میں مستعمل ہے‘ یعنی کسی چیز کو ختم کر دینا‘ کسی کام کو مکمل کر دینا‘ عربی میں بھی اسی معنی میں مستعمل ہے اور بغیر صلے کے آتا ہے‘ جیسے خَتَمْتُ الْقُرْآن ’’مَیں نے قرآن کی تلاوت پوری کر لی۔‘‘ البتہ جب اس کے ساتھ عَلٰی کا صلہ آ جائے (خَتَمَ عَلٰی) تو اس کے معنی ہوں گے کسی شے پر مہر لگا دینا‘ یعنی کسی چیز کو مہر بند (سیل بند) کر دینا کہ اب اس میں کوئی شے نہ داخل ہو سکے اور نہ نکل سکے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو seal کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر۔ ’’سمع‘‘ (سننا) اگرچہ مصدر ہے لیکن یہ لفظ مصدر سے آگے بڑھ کر ’’سماعت‘‘ کے لیے بھی مستعمل ہے اور آلۂ سماعت (کان) کے لیے بھی۔ مزید یہ کہ واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ یہاں مراد کان ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کانوں پر بھی مہر کر دی ہے۔

﴿وَعَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫﴾

''اوران کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔''

بصر (دیکھنا) مصدر ہے۔ یہاں بینائی اوراس کے ساتھ ہی دیکھنے والی شے یعنی آنکھ مراد ہے۔ اَبْصَار جمع کے صیغہ میں آیا ہے آنکھوں کے لیے۔ ''اِن کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔''

﴿وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷﴾

''اوران کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

بہت بڑے عذاب اور بہت بڑی سزا سے مراد آخرت کی سزا ہے جو انہیں ابدی جہنم کی صورت میں ملے گی۔

ختمِ قلوب کی حقیقت

اب ختمِ قلوب کے بارے میں بھی کچھ عرض کردوں۔ ''ستیارتھ پرکاش'' کے مصنف کو یقیناً اس پر بھی اعتراض ہوا ہوگا کہ جب اللہ نے ہی ان کے دلوں پر اوران کے کانوں پر مہر کردی تو ان کافروں کا قصور کیا ہے! اللہ نے مہر کردی' ہدایت ان کے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوسکتی تو پھر ان کی مذمت کس بات کی؟ ان کا قصور کیا ہے؟ یہ قاعدہ بھی قرآن میں تفصیل سے آیا ہے کہ جب کسی شخص کے اندر ضد' عناد' ہٹ دھرمی' تعصب اور تکبر جیسی چیزیں پیدا ہوجائیں اوراس کی وجہ سے وہ حق سے روگردانی کرے تو شروع میں تو وہ اس شے کو حق سمجھ کر اعراض کر رہا ہوتا ہے' لیکن ہوتے ہوتے اس کی اپنی ذہنیت اس طرح مسخ ہوجاتی ہے کہ واقعتاً اس کے اندر صلاحیت ہی نہیں رہتی کہ حق کو حق سمجھ سکے۔ اس سے حقیقت کو دیکھنے کی استعداد ہی سلب کرلی جاتی ہے۔

فزیالوجی کے حوالے سے بھی یہ طبعی مظہر (physical phenomenon) سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا جو عضو جس کام کے لیے بھی بنایا ہے اگر وہ کام اس سے لیا جاتا رہے تو وہ عضو صحیح و سالم رہے گا' اوراگر وہ کام اس سے نہ لیا جائے تو اس میں ڈی جنریشن ہوگی یعنی اس عضو کے اندر سے وہ صلاحیت سلب ہونی شروع ہوجائے گی۔

مثلاً کسی انسان کے ایک جوڑ کو اگر لاک کردیں اوراس کے اوپر پلستر بہت دیر تک کے لیے چڑھا رہے تو یہ جوڑ جام ہوجائے گا اوراس کے اندر حرکت کی صلاحیت باقی نہیں رہے گی۔ آنکھوں پر طویل عرصے تک پٹی بندھی رہی تو بینائی سلب ہوجائے گی۔ اسی طرح انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے حق کو سمجھنے اور پہچاننے کی استعداد رکھی ہے۔ جیسے ایک بصارتِ ظاہری ہے' اسی طرح ایک بصیرتِ باطنی بھی اس کو عطا کی گئی ہے۔ اس بصیرت نے بتایا ہے کہ یہ صحیح ہے' یہ حق ہے۔ اگر اسے ردّ کردیا اور مسلسل ردّ کرتے رہے تو وہ بصیرت ہی ختم ہوجائے گی۔ اللہ تعالیٰ صحیح اور غلط میں امتیاز کی وہ صلاحیت ہی سلب کرلے گا۔ اسی کو تعبیر کیا جاتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾۔

یہ ابتدائی مرحلہ نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت انسان کے اعراض' انکار' حق کو حق سمجھنے کے باوجود قبول نہ کرنے پر اصرار کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس کی سزا اس دنیا میں یہ ہے کہ پھر اس کے اندر حق کو پہچاننے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ اس قانون کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الصّف میں بایں الفاظ بیان فرمایا: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ﴾ ''پھر جب وہ ٹیڑھے ہوگئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی ٹیڑھا کردیا۔'' یہ دلوں کو کج کردینا بعد میں ہوا۔ یہ نتیجہ ہے اس کا کہ جب وہ ٹیڑھے ہوئے۔ ساتھ ہی فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵﴾ ''اور اللہ ایسے فاسقوں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔'' جو ہدایت کو اس طرح ردّ کردیں' ہدایت کی ناقدری کریں' اللہ تعالیٰ انہیں زبردستی ہدایت نہیں دیتا۔ اگر زبردستی ہدایت دے تو پھر اس پر اجر و ثواب کس بات کا؟ اگر کسی کو زبردستی گمراہ کردے تو اس کی گمراہی پر عذاب اور سزا کس بات کی؟ یہ تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار (choice) دیا ہے۔ اگر انسان اپنی صلاحیت کو معطل کرکے رکھ چھوڑتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس صلاحیت کو سلب کرلیتا ہے۔

اس اعتبار سے بات واضح ہوگئی کہ ہم یہاں تاویل خاص ہی پیش نظر رکھ سکتے ہیں۔ اگر تاویل عام کی صورت میں جو بھی کافر ہے اس پر اس کا اطلاق کردیں گے تو پھر تبلیغ کس

لیے؟ انذار اور تبشیر کا ہے کے لیے؟ ایسا تو نہیں ہے کہ جو اِس وقت کفر میں ہے وہ ہمیشہ کفر ہی میں رہے گا۔ چنانچہ یہاں پر درحقیقت تاویل خاص ہی منطبق ہوگی کہ وہ لوگ جو اپنے عناد‘ بغض‘ تعصب‘ تکبر‘ حسد اور شقاق کی وجہ سے کفر پر اَڑ گئے‘ ضِدم ضِدا کی وجہ سے اس پر جازم ہو گئے‘ اے نبی ﷺ! آپ ان کو خواہ کتنا ہی سمجھائیں‘ افہام و تفہیم میں اپنے آپ کو کتنا ہی ہلکان کر لیں‘ کتنے ہی دلائل و براہین کی روشنی ان کے سامنے لے آئیں‘ یہ اب ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ صلاحیت ہی سلب کر لی ہے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اس کے لیے قرآن مجید میں کہیں ’’طَبَعَ اللّٰہُ‘‘ کا لفظ بھی آتا ہے کہ اللہ نے ٹھپّا لگا دیا ہے۔ جیسے سورۃ النحل میں فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿١٠٨﴾﴾

’’یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں‘ کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے‘ اور یہی لوگ ہیں جو غافل ہیں۔‘‘

زیرِ مطالعہ آیت میں آنکھوں کے لیے ذرا مختلف اسلوب اختیار کیا گیا: ﴿وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ﴾ ’’اور ان کی آنکھوں پر پردے ہیں‘‘ اس لیے کہ آنکھ صرف سامنے دیکھتی ہے۔ ہمارا بینائی کا دائرہ (field of vision) محدود ہے۔ سامنے کے علاوہ تھوڑا دائیں‘ تھوڑا بائیں دیکھ سکتے ہیں‘ لیکن کان اور دل کا معاملہ درحقیقت کسی خاص سمت سے متعلق نہیں ہے۔ آواز کسی بھی سمت سے کان میں آ جائے گی۔ اسی طرح سے ہمارے دل کا معاملہ ہے۔ یہ دل صرف خون کو پمپ کرنے والا آلہ ہی نہیں بلکہ انسان کی معنوی حقیقت ہے‘ جو روح کا مسکن ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی خاص سمت معیّن نہیں ہے کہ اسی سے اس کو کوئی خبر پہنچ رہی ہو اور معلومات پہنچتی ہوں‘ بلکہ اسے ہر چہار طرف سے حقائق کا اِدراک اور شعور ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے ﴿قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ﴾ کے لیے لفظ ’’خَتَمَ‘‘ استعمال کیا گیا‘ جبکہ آنکھ سے چونکہ انسان سامنے ہی کی چیز‘ ایک ہی سمت میں دیکھتا ہے‘ اس لیے وہاں لفظ ’’غِشَاوَةٌ‘‘ (پردہ) آ گیا ہے۔

سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات سے تقابل

قرآن مجید میں ان آیات کے لیے مثنیٰ سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات ہیں۔ چنانچہ یہ آیات جو ہم نے اس نشست میں پڑھی ہیں ان کا سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات سے اجمالی طور پر ایک تقابل کر لینا مفید ثابت ہو سکتا ہے:

﴿يٰسٓ ﴿١﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿٢﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣﴾ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٤﴾﴾

’’یٰس‘ قسم ہے اس قرآن کی جو حکمت بھرا ہے۔ (اے محمد! ﷺ) یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔ صراطِ مستقیم پر ہیں۔‘‘

یہاں ’’صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ‘‘ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں آ چکا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴾ سورۃ البقرۃ کے شروع میں صرف لفظ ’’هُدًى‘‘ (ہدایت) آیا‘ صِرَاط کا لفظ دوبارہ نہیں لایا گیا۔

﴿تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿٥﴾﴾

’’(اس قرآن کا) نازل کیا جانا ہے اُس ہستی کی جانب سے جو بہت زبردست‘ نہایت رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

یعنی قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں ہرگز کوئی شک نہیں۔

﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿٦﴾ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٧﴾﴾

’’تاکہ آپ خبردار کریں اُس قوم کو جن کے آباء و اَجداد کو خبردار نہیں کیا گیا‘ پس وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی اکثریت پر ہمارا قول (قانونِ عذاب) سچ ثابت ہو چکا ہے تو اب وہ ایمان نہیں لائیں گے۔‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ قانون کہ جو کوئی مسلسل اپنے تکبر اور ضد کی بنا پر حق سے اعراض کرے گا اس کے اندر سے حق کو پہچاننے کی صلاحیت ہی سلب کر لی جائے گی‘ وہ ان کے اوپر منطبق ہو چکا ہے‘ یہ اس کی زد میں آ چکے ہیں۔

﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝۸﴾

''ہم نے ان کی گردنوں میں طوق لٹکا دیے ہیں پس وہ اِن کی ٹھوڑیوں تک آ گئے ہیں' جس کی وجہ سے ان کے سر اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔''

یہ معناً اشارہ ہو رہا ہے تکبر کی طرف۔ تکبر میں انسان کی گردن اکڑ جاتی ہے۔ یہ جو ابوجہل اور عتبہ بن ابی معیط وغیرہ کی گردنیں اکڑی ہوئی ہیں اصل میں تمہیں نظر نہیں آ رہا' ان کے گلوں میں ہم نے طوق ڈال دیے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کی گردنیں اکڑی ہوئی ہیں اور سر اٹھے ہوئے ہیں۔

﴿وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ۝۹﴾

''اور ہم نے ان کے سامنے بھی دیوار حائل کر دی ہے اور ان کے پیچھے بھی' اس طرح ہم نے ان کو ڈھانپ دیا ہے' پس اب وہ دیکھ نہیں سکتے۔''

یعنی سامنے کے حقائق انہیں نظر نہیں آ رہے اور پیچھے کی جو تاریخِ انسانی ہے وہ اس سے بھی سبق حاصل کرنے کو تیار نہیں۔ (سورۂ یٰسین مکی سورت ہے جس میں انبیاء و رسل علیہم السلام کے تاریخی حالات و واقعات اور ان کی خبریں' یہ سارے مضامین تفصیل سے آئے ہیں۔)

﴿وَسَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) اِن کے حق میں بالکل برابر ہے خواہ آپ ان کو انذار کریں یا نہ کریں' یہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ ۚ﴾

''آپؐ تو بس اُسی شخص کو خبردار کر سکتے ہیں جو الذکر (قرآن) کی پیروی کرے اور غیب میں ہونے کے باوجود رحمان سے ڈرے۔''

﴿فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِیْمٍ ۝۱۱﴾

''پس ایسے انسان کو آپؐ بشارت دیجیے مغفرت کی اور باعزّت اجر کی۔''

اللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! آمین یاربّ العالمین oo

سب سے کمزور گھر!

شجاع الدین شیخ

(خطابِ جمعہ: ۳ اکتوبر ۲۰۲۵ء' قرآن اکیڈمی' لاہور)

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

﴿فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّیْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝۴۰ مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝۴۱﴾ (العنکبوت)

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِیْرًا ۝۲۱﴾ (الاحزاب) صدق اللّٰہ العظیم

قرآن حکیم میں سے سورۃ العنکبوت کی دو آیات (۴۰ اور ۴۱) اور سورۃ الاحزاب کی ایک آیت (۲۱) تلاوت کی گئی۔ ان آیات کے ضمن میں چند باتوں کی تذکیر اور یاددہانی مقصود ہے۔

گزشتہ اقوام پر عذابِ الٰہی

سورۃ العنکبوت قرآن حکیم میں بیسویں اور اکیسویں پارے میں ہے۔ عنکبوت کا ترجمہ مکڑی کیا جاتا ہے۔ یہ مکی دور کی سورت ہے' خاص طور پر وہ دور جس کو ''تعذیب المسلمین'' کہا جاتا ہے یعنی جب ایمان والوں پر زندگی تنگ کی گئی۔ نبی اکرم ﷺ نے آغازِ وحی کے بعد ابتدائی تین برس تک دعوت کا کام انفرادی سطح پر کیا۔ اس کے بعد حکم ہوا کہ اعلانیہ دعوت پیش کیجیے۔ جب اعلانیہ دعوت پیش کی گئی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس دعوت کے عمل میں اپنا حصہ ڈالا تو مسلمانوں پر تعذیب کا دور آیا' مشقتوں کا دور آیا' مشکلات کا دور آیا۔ ان مشکلات کے دور

کے حوالے سے سورۃ العنکبوت کا نزول بھی ہے۔ اسی دور میں جو کم وبیش پانچ نبوی ہے‘ سورۃ الکہف کا نزول بھی ہوا۔ بہت ساری ہدایات ہیں۔ ہمارا ’’مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب‘‘ جسے بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے تفصیل سے بار ہا بیان کیا‘ اس میں سورۃ العنکبوت کا پہلا رکوع اور مزید کچھ آیات بھی شامل ہیں۔ چنانچہ مشکلات کا یہ دور بڑا اہم موضوع ہے‘ جو سورۃ العنکبوت میں بھی آتا ہے اور سورۃ الکہف میں بھی۔

سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۰ کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ پچھلی اقوام پر جو مختلف نوعیت کے عذاب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے آئے‘ ان کی کم وبیش تمام ہی اقسام کو اس میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ﴾

’’چنانچہ ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اُس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا۔‘‘

یہ عموم کے اعتبار سے اقوام کا ذکر آ رہا ہے۔ اس سے پچھلی آیات میں بھی کفر کے حوالے سے‘ شرک کے حوالے سے‘ پیغمبروں کی دعوت کو رد کرنے کے حوالے سے لوگوں کا تذکرہ ہوا۔ یہ موضوعات اس سورت میں بھی اور قرآن حکیم کی دوسری سورتوں میں بھی بار بار آتے ہیں۔ پھر ان قوموں پر آنے والے عذابوں کو بھی قرآن کریم میں جا بجا بیان کیا گیا ہے۔ ان پر آنے والے عذابوں کو ایک سمری کے طور پر اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ بیان فرما رہا ہے۔ فرمایا:

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ﴾

’’تو اُن میں وہ بھی تھے جن پر ہم نے زوردار آندھی بھیجی۔‘‘

یعنی ایسی تیز ہوا کہ جس میں پتھروں کی بارش بھی برسا دی گئی۔

﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ﴾

’’اور اُن میں وہ بھی تھے جنہیں چنگھاڑ نے آ پکڑا‘ اور اُن میں وہ بھی تھے جنہیں ہم نے زمین میں دھنسا دیا‘ اور ان میں وہ بھی تھے جن کو ہم نے غرق کر دیا۔‘‘

چار قسم کی باتیں آئیں: (۱) تیز ہوا اور پتھروں کا برسایا جانا۔ اس کا ذکر ہم حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے حوالے سے پڑھتے ہیں۔ (۲) زوردار آواز‘ چیخ کا عذاب۔ سورۃ یٰسین میں بھی یہ لفظ

آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو بھیجا جس نے چیخ ماری اور اسی چیخ کے نتیجے میں قوم پر موت طاری ہوئی۔ اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر جو عذاب آئے اس میں زوردار آواز کا عذاب بھی تھا۔ (۳) جن کو زمین میں دھنسا دیا گیا‘ وہ قارون کا واقعہ ہے‘ جسے ہم سورۃ القصص میں پڑھتے ہیں۔ (۴) حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو غرق کیا گیا‘ آلِ فرعون کو بھی غرق کیا گیا۔ آگے فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۴۰﴾

’’اور اللہ ایسا نہیں تھا کہ ان پر ظلم کرتا‘ بلکہ وہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔‘‘

شرک: عظیم ترین گناہ

سب سے بڑا ظلم تو یہ ہے کہ بندہ شرک کرے۔ سورۃ لقمان میں فرمایا:

﴿يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝۱۳﴾

’’اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ شرک مت کرنا۔ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔‘‘

شرک کی وہ نوعیتیں جو ہمارے ہاں بھی موجود ہیں‘ ان کا ذکر اگلی آیت کے ذیل میں آئے گا‘ ان شاء اللہ تعالیٰ! یہاں بتایا جا رہا ہے کہ سب سے بڑا ظلم تو شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ گزشتہ اقوام پر جو عذاب نازل کیے گئے وہ ظلم کا معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے‘ شرک میں مبتلا ہو کر‘ کفر میں مبتلا ہو کر اور دیگر برائیوں میں مبتلا ہو کر۔ مثلاً حضرت لوط علیہ السلام کی قوم شرک کے علاوہ ہم جنس پرستی کے قبیح فعل کا بھی شکار ہو گئی تھی۔ آج دنیا کے کئی ممالک میں اسے قانونی تحفظ دے دیا گیا ہے۔ قانون سازی کے تحت اس کو‘ معاذ اللہ‘ حلال کر دیا گیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم میں شرک بھی تھا اور وہ ناپ تول کی کمی میں بھی مبتلا تھی‘ جو آج ہمارے ہاں بھی رائج ہے۔ فرعون اور آلِ فرعون نے سیاسی سطح کا بھی ایک جرم کیا تھا۔ شرک تو وہاں پر تھا لیکن قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا کر ان کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ چنانچہ یہ معاشی سطح پر‘ معاشرتی سطح پر‘ سیاسی سطح پر قوموں کے جرائم کا ذکر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان جرائم کی وجہ سے عذاب آیا کرتا تھا۔

قوموں کے اعمال اور کردار میں بگاڑ کی وجہ سے ان پر اللہ کا عذاب آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ آتی ہے۔ زلزلے دنیا میں ویسے بھی آتے ہیں‘ بارشیں ویسے بھی ہوتی ہیں لیکن

زلزلے قوموں کے کردار کے بگاڑ کی وجہ سے بھی آتے ہیں۔ پتھروں کی بارش قوموں کے کردار کے بگاڑ کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔ کسی کے اوپر زلزلہ مسلط ہونا‘ جیسے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے کردار کے بگاڑ کی وجہ سے ہوا‘ زمین پر اس طرح کی کیفیات مسلّط کیے جانے کے یہ سب میٹافزیکل اسباب ہیں۔ یعنی قوموں کے کردار میں بگاڑ کی وجہ سے ان پر اللہ کا عذاب آتا تھا۔ اس میں ہمارے لیے رہنمائی کیا ہے؟ اِس اُمّتِ مُسلمہ کے حوالے سے اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعاؤں کا حاصل تو یہ ہے کہ مجموعی طور پر اُمّت مٹائی نہیں جائے گی‘ لیکن چھوٹے چھوٹے عذابوں کا آنا کبھی آزمائش کے طور پر‘ کبھی تنبیہات کے طور پر جاری رہے گا۔ یہ نکتہ ہے جو قوموں کے ان واقعات کے بیان میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ﴾

’’اُن لوگوں کی مثال جنہوں نے اللہ کے سوا کچھ حمایتی بنا رکھے ہیں‘ ایسی ہے جیسے مکڑی کی مثال‘‘

غیر اللہ کو اپنا حمایتی سمجھ رکھا ہے‘ کارساز بنا دیا ہے۔ کیسے؟ فرمایا:

﴿اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ﴾

’’جس نے ایک گھر بنایا۔ اور بے شک تمام گھروں میں سب سے زیادہ کمزور گھر مکڑی ہی کا گھر ہے۔‘‘

مکڑی جو جالا بُنتی ہے‘ یہاں اس کی بات ہو رہی ہے۔

﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۱﴾ (العنکبوت) ’’کاش کہ انہیں معلوم ہوتا!‘‘

تمثیلاتِ قرآن

سورت کا نام عنکبوت (بمعنی مکڑی) ہے‘ جس کا ذکر اس مقام پر آ گیا۔ اس ضمن میں یہ اصول سمجھ لیں کہ کبھی تو کسی سورۃ کا نام ایسے لفظ سے موسوم ہوتا ہے جو اس سورت میں موجود ہو۔ سورۃ البقرہ میں لفظ بقرۃ موجود ہے‘ بنی اسرائیل کا گائے سے متعلق ایک واقعہ مذکور ہے‘ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ساری کی ساری سورۃ گائے کے حوالے سے ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سورت کا نام ایسا ہو کہ وہ لفظ سورت میں موجود نہ ہو۔ اس کی آسان ترین مثال سورۃ الاخلاص

ہے‘ جس میں لفظ اخلاص موجود نہیں ہے۔ یہ تو ایک نکتہ تھا سورتوں کے نام کے تعلق سے۔ یہاں عنکبوت کا ذکر آیا۔

قرآن کریم میں ایک لفظ آتا ہے مَثَل‘ جیسے یہاں آیا: كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ۔ یہ تمثیلات بھی بار بار قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں۔ قرآن کریم میں واقعات اور قصے بھی ذکر کیے گئے ہیں‘ جبکہ قرآن قصوں اور کہانیوں کی کتاب نہیں ہے‘ معاذ اللہ! قرآن تو ہدایت کی کتاب ہے۔ دراصل ان واقعات اور قصّوں سے باتیں سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن مثالیں یا تمثیلات بیان کرتا ہے‘ جسے انگریزی میں ہم parables کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے تمثیلات بیان کی ہیں۔ مثلاً ایک تمثیل سورۃ الحج کے آخری رکوع میں ہے۔ یہ رکوع بھی ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے‘ جس کو بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے کئی مرتبہ بیان فرمایا جو کتابی شکل میں بھی ہے‘ آڈیو اور ویڈیو میں بھی ہے‘ مختصر بھی اور طویل بھی۔ ہمارے رجوع اِلی القرآن کورسز‘ شارٹ کورسز اور دروسِ قرآن میں پڑھایا بھی جاتا ہے۔ اس میں یہ ذکر کیا گیا کہ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے‘ بلکہ مکھی اگر ان کے سامنے سے کچھ اُچک کر لے جائے تو یہ بے چارے اسے واپس بھی چھڑا نہیں سکتے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝۷۳﴾

’’کس قدر کمزور ہے طالب بھی اور مطلوب بھی!‘‘

اس سے اللہ تعالیٰ نے ایک حقیقت واضح کی ہے کہ تم اگر مخلوق میں سے کسی کو پکارو تو وہ خود محتاج ہے‘ اسے پکارنے کا فائدہ کیا! جو خود محتاج ہے وہ کسی اور کے کیا کام آ سکتا ہے؟ قرآن کریم بہت سارے حقائق کو سمجھانے کے لیے ہمارے سامنے تمثیلات رکھتا ہے۔ اسی میں سورۃ العنکبوت کا یہ مقام بھی ہے۔ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر اوروں کو کارساز بنائیں‘ سمجھیں کہ یہ ہمارا کام بنا دیں گے‘ ہمیں کچھ دے دیں گے‘ ہماری بگڑی سنوار دیں گے‘ ہمیں تحفظ دے دیں گے‘ ہمیں بچا لیں گے‘ سمجھیں کہ یہ ہمارے نفع نقصان کے اختیار رکھنے والے ہیں تو فرمایا کہ جو یہ رویہ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے مثال ایسی ہے جیسے کہ مکڑی کا گھر‘ اور تمام گھروں میں سب سے زیادہ کمزور مکڑی کا گھر ہے۔ یہ ہم سب کے مشاہدے کی بات ہے۔ کسی مکڑی نے جالا بنایا‘ ہم نے

انگلی سے چھوا تو وہ ختم‘ ہوا چلی تو ختم‘ کوئی چیز ٹکرائی تو ختم۔

ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس گھر میں ایک مکڑی ہوگی‘ ایک مکڑا ہوگا‘ تو کئی مرتبہ مکڑی مکڑے کو مار ڈالتی ہے۔ یہ گھر اتنا کمزور ہے کہ مادہ اپنے نر پر غالب آجاتی ہے۔ اس کو بھی ذہن میں رکھیے گا‘ جبکہ اللہ نے نر (مرد) کو قوام بنایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ (النساء: ۳۴) ’’مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔‘‘ گھر چلانے کی ذمہ داری اصولاً‘ اصلاً‘ اولاً مرد پر ڈالی گئی ہے۔ گھر والوں کی مادی حاجات پوری کرنا‘ روحانی ضرورتوں کا خیال رکھنا‘ فیصلہ سازی جیسے معاملات مرد کے ذمہ لگائے گئے ہیں۔

مکڑی کے گھر کی تمثیل اللہ تعالیٰ کس کے لیے بیان کر رہا ہے؟ پچھلی آیت میں گزشتہ اقوام کا ذکر آیا کہ وہ بتوں اور دیوی دیوتاؤں کو پوجنے والے تھے‘ اللہ کا کفر کرنے والے‘ اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے اور اللہ کو چھوڑ کر اس کی مخلوق میں سے کسی کو خدائی کا درجہ دے کر نفع نقصان کا اختیار رکھنے والے سمجھتے تھے۔ ان کا انجام پچھلی آیت میں بیان کر دیا گیا۔ اب یہ آیت ۴۱ ہے جس میں اللہ تعالیٰ یہ تمثیل بیان کر رہا ہے کہ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر اوروں کو کارساز بناتے ہیں‘ اپنا حمایتی سمجھتے ہیں‘ نفع نقصان کا مالک سمجھتے ہیں‘ اپنی حفاظت کرنے والا سمجھتے ہیں‘ انہی سے اُمیدیں رکھتے ہیں‘ ان کا یہ رویہ بھی انتہائی بودا اور کمزور ہے جیسے کہ مکڑی کا گھر انتہائی کمزور ہوا کرتا ہے۔ اس تمثیل کو تھوڑا اور کھولیں۔ یہ انفرادی سطح کے معاملات بھی ہیں اور اجتماعی سطح کے معاملات بھی۔

اس ضمن میں بھی استادِ محترم بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے بہت عمدہ خطابات ہیں۔ موضوع ہے: ’’حقیقت و اقسامِ شرک۔‘‘ جو ماسٹر پیس ہے وہ چھ گھنٹے کے آڈیو کیسٹس ہیں۔ اب وہ ڈیجیٹائز ہو چکے ہیں۔ ویڈیوز کے حوالے سے ۱۹۸۵ء کی ایک ’’ابوظبی سیریز‘‘ ہے جو سب سے متاثر کن اور عمدہ ترین ہے۔ اس کا دورانیہ تقریباً ڈھائی تین گھنٹے ہے۔ پھر جب ڈاکٹر ذاکر نائیک کی دعوت پر ڈاکٹر اسرار احمدؒ ہندوستان تشریف لے گئے تھے تو پیس ٹی وی پر جو پروگرامز نشر ہوئے وہ بھی اسی موضوع پر دو اڑھائی گھنٹے کے معروف ویڈیوز ہیں۔ میں دعوت دوں گا کہ جن لوگوں کو اس موضوع سے دلچسپی ہے‘ وہ ان تقاریر کو ضرور سنیں یا کتاب ’’حقیقت و اقسامِ شرک‘‘ کا مطالعہ کریں۔

نفع نقصان کا مالک کون؟

ایک تو کھلا مشرک ہے‘ کھلا کافر ہے۔ ایک مسلمان ہے جس کو اندیشہ ہے یا جس کے بارے میں اندیشہ ہے کہ وہ کسی نوعیت کے شرک میں مبتلا نہ ہو جائے۔ ؎

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں!

ایک سجدہ کسی دیوی دیوتا کے سامنے ہوتا ہے‘ یہ بھی شرک ہے۔ اس کو سمجھنا کہ یہ حاجت روا ہے‘ مشکل کشا ہے‘ میرے نفع نقصان کا مالک ہے‘ یہ بھی شرک ہے۔ کسی غیر مرئی قسم کی طاقت اور دیوی دیوتاؤں کا تصور رومن ایمپائر کے شرک میں بھی رہا‘ ہندومت میں بھی ہے۔ کسی غیر مرئی قسم کی شے کو مانا جائے کہ وہ ہمارے نفع نقصان کی مالک ہے تو یہ بھی شرک ہے۔ کبھی چلتے پھرتے انسانوں سے بھی بندے ایسی توقعات رکھتے ہیں کہ میرے نفع نقصان کا مالک یہ ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے تو یہاں تک کہا کہ اگر ظاہری اعتبار سے میں آپ سے کہتا ہوں مجھے پانی پلا دیجیے‘ میرا فلاں سامان گاڑی پر رکھوا دیجیے تو اس میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ دنیا اسباب کے تحت چلتی ہے۔ البتہ ہم نے کسی سے کسی کام کے لیے ایک دفعہ کہا‘ دو دفعہ کہا‘ تین دفعہ کہا‘ بس بہت ہے۔ اس کے بعد اللہ کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے بعد بھی اگر ڈٹے ہوئے ہیں تو پھر باطنی طور پر تھوڑا سا جائزہ لے لیا جائے کہ اگر میں اللہ ہی کو مسبّب الاسباب سمجھتا ہوں تو مخلوق کے سامنے یہ بار بار کی خوشامدیں کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے! ڈاکٹر صاحبؒ نے ان چیزوں کو اس حد تک واضح کیا ہے۔ چنانچہ ’’حقیقت و اقسامِ شرک‘‘ پر چھ گھنٹے والے خطابات کا سننا یا پھر ان کا پڑھ لیا جانا اس موضوع کے اعتبار سے بڑا اہم ہوگا۔

ظاہر کے اعتبار سے ہم کسے اپنے نفع نقصان کا مالک سمجھتے ہیں؟ کسی مال والے کو‘ کسی سیٹھ کو‘ اپنے افسر کو‘ اپنے آجر کو‘ کسی ادارے کے سربراہ کو؟ کیا وہ واقعی نفع نقصان کا مالک ہے؟ آپ کا میرا عقیدہ کیا کہتا ہے کہ ’’النَّافِع‘‘ کس کی ذات ہے؟ اللہ کی! ’’الضَّار‘‘ (نقصان پہنچانے والا) کس کی ذات ہے؟ اللہ کی! ظاہری اسباب کے تحت دوسرے کے کام آنا ایک الگ شے ہے لیکن یہ سمجھنا کہ یہی میرے نفع نقصان کا مالک ہے‘ یہ ہاں کر دے تو میرا کام بنے گا‘ یہ میری پشت پناہی کرے گا تو میری کرسی بچے گی۔ اگر ایسا ہے تو پھر شرک اور کس چیز کا نام ہے؟

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

آج مسلم حکمران کدھر کھڑے ہیں؟ کس طرح ٹرمپ جیسے چالاک اور عیار شخص کو جو دو ہاتھ آگے نظر آتا ہے نیتن یاہو سے، امن کا علم بردار کہہ رہے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ اس نے امن کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ اس کی حمایت میں ہم کھڑے ہو گئے ہیں۔ ہمارے حکمران اور مقتدر طبقات اس کے ساتھ مسکراہٹوں کے ساتھ تصویریں کھنچوانے کو بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ اللہ اکبرُ کَبِیْرًا! ''امن معاہدہ'' کچھ نہیں سوائے اس کے کہ حماس کی کوئی بات نہیں ماننی۔ فلسطین کے مسلمانوں کو کوئی حق نہیں کہ ان کے مسئلے کے بارے میں ان کی رائے لی جائے، اس بارے میں فیصلہ ٹرمپ کرے گا یا نیتن یاہو۔ مسلم ممالک کے حکمرانوں کی اگرچہ رائے لے لی گئی لیکن اب ان کو کہنا پڑ رہا ہے کہ ہماری تجاویز شامل نہیں کی گئیں۔ ہم نے جو بات کہی تھی وہ تو اس ۲۰ نکاتی امن فارمولے میں آئی ہی نہیں ہے۔ اب اپنی بغلیں جھانک رہے ہیں۔ آج کس سے امیدیں ہیں؟ عرب حکمرانوں نے ٹرمپ کی خدمت میں کیا کچھ پیش نہیں کیا؟ کوئی طیارے سجا سجا کر دیتا ہے۔ انتہائی لجاجت کے ساتھ خوشامدیں کر رہے ہیں۔ اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ ہم اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہو رہے۔ یہ اندیشہ ہے کہ ٹرمپ ناراض ہو جائے گا۔ ہماری سربراہی اور بادشاہتیں ختم ہو جائیں گی۔

نیچے سے اوپر تک دیکھ لیجیے، ایک ہی رویہ ہے، ہمارا یہ کام نہیں کہ محض اپوزیشن کا کردار ادا کریں، بلکہ میں نے بات نیچے سے شروع کی تھی۔ سیٹھ کی بات پہلے کی ہے، آجر کی بات پہلے کی ہے۔ ادارے کے سربراہ کی بات پہلے کی ہے۔ حکمرانوں کی بات بعد میں کی ہے۔ نیچے سے چلیں اور اوپر تک جائیے۔ اب دوبارہ آیت کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

''اُن لوگوں کی مثال جنہوں نے اللہ کے سوا کچھ حمایتی بنا رکھے ہیں ایسی ہے جیسے مکڑی کی مثال، جس نے ایک گھر بنایا۔ اور بے شک تمام گھروں میں سب سے زیادہ کمزور گھر مکڑی ہی کا گھر ہے۔ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا!''

شرک صرف کسی دیوی دیوتا یا بُت کے سامنے سجدہ کرنے ہی کا نام نہیں ہے۔ اللہ کے پیغمبر ﷺ تو یہ فرماتے ہیں: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَ عَبْدُ الدِّرْھَمِ)) ''ہلاک ہو گیا درہم کا

بندہ اور دینار کا بندہ۔'' یہ بخاری شریف کی روایت ہے۔ بندگی تو اللہ کی کرنی تھی مگر مال کا بت بنا رکھا ہے، جس کی سیوا اور پرستش ہوتی ہے۔ مال جمع کرنے کے لیے، اسے بڑھانے کے لیے اللہ کا حکم اگر ٹوٹے تو کوئی حرج نہیں۔ حرام میں مبتلا ہونے پر غیرت کا جنازہ نکلے تو کوئی پروا نہیں، بس میرا مال اور مفاد محفوظ رہنا چاہیے۔ یہ بھی شرک ہی تو ہے۔ مال کا بُت نظر نہیں آ رہا لیکن اندر تو بنا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کسی نے بادشاہت کو معبود بنا لیا ہے، کسی نے اقتدار کو معبود بنا لیا ہے، کسی نے اپنے مفادات کو معبود بنا رکھا ہے۔ (بانی محترمؒ علّامہ اقبال کا یہ مصرع پڑھا کرتے تھے: ع ''می تراشد فکرِ ماہر دم خداوندے دگر!'') اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر اللہ کا حکم پامال ہو رہا ہے، شریعت کا حکم پامال ہو رہا ہے، اُمّت کا مفاد پامال ہو رہا ہے، تو پھر شرک اور کس چیز کا نام ہے؟ اللہ تعالیٰ میری، آپ کی، ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ ہمیں بھی شرک کی ہر شکل سے محفوظ رکھے اور ہمارے حکمرانوں کو بھی!

اُسوۂ رسول ﷺ کا ہمہ وقتی استحضار

ایک اور آیت میں نے صرف یاد دہانی کے لیے تلاوت کی تھی۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۱ کافی معروف ہے۔ فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾﴾ (الاحزاب)

''(اے مسلمانو!) تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ) میں ایک بہترین نمونہ ہے، (یہ اُسوہ ہے) ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ سے ملاقات اور آخرت کی اُمید رکھتا ہو اور کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتا ہو۔''

اللہ کے نبی ﷺ کی سیرت پر اور زندگی پر غیر مسلموں نے بھی بہت عمدہ کتابیں لکھ ڈالی ہیں مگر ایمان کی دولت نہ ہونے کی وجہ سے انہیں ہدایت نہیں ملی۔ ایمان کی دولت اگر نہیں ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ ان کے علم میں اضافہ ہو گیا۔ یہ کتابیں اتنی مستند ہیں کہ مسلمان بھی ان کا حوالہ دیتے ہیں۔ البتہ مصنف کے اندر اگر ایمان نہیں تو اسے اصل فائدہ نہیں ملے گا۔ اللہ کا ذکر پیش نظر نہیں تو آخرت میں کوئی فائدہ نہیں ملے گا۔ یہ آیت آج میں نے اس لیے تلاوت کی ہے کہ ماہ ربیع الاول گزر گیا، اب ربیع الثانی ہے۔ تمام مسلمانوں نے نبی اکرم ﷺ سے اپنی

محبت کا اظہار کر دیا۔ اس کے بعد ہم پھر دوبارہ سو جائیں گے what is next? اب بہت سے لوگوں کو اگلے سال اللہ کے رسول ﷺ یاد آئیں گے۔ میری گزارش ہے کیوں نہ ہم اپنے اپنے گھروں کی سطح پر طے کریں کہ سیرتِ رسول ﷺ کا مطالعہ سارا سال جاری رہے! تنظیم اسلامی میں ہم گھروں کے لیے بھی باقاعدہ ایک تربیتی نصاب دیتے ہیں‘ جس کو ’’گھریلو اُسرہ‘‘ کہا جاتا ہے۔ اس میں ہم تجویز کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا ذکر آئے‘ احادیث مبارکہ کا ذکر آئے‘ سیرتِ مطہرہ کا ذکر آئے۔ روزانہ پانچ دس منٹ ہو جائے تو بہت اچھی بات ہے۔ ہفتہ وار بنیادوں پر اگر ایک گھنٹے کا ہو جائے تو بہت مناسب ہے۔ کوشش کریں کہ ہمارے گھروں میں اللہ کے پیغمبر ﷺ کی سیرت کا مطالعہ ہو۔

’’آدابِ زندگی‘‘ کے عنوان سے مولانا یوسف اصلاحیؒ کی ایک کتاب ہے۔ اس میں بڑے عام فہم انداز سے حضور ﷺ کی سیرت‘ سنتوں اور اعمال کا ذکر آ جاتا ہے‘ روزمرہ کے معاملات کے حوالے سے بھی اور اجتماعی معاملات کے حوالے سے بھی۔ اپنے نصاب میں بھی اس کو ہم نے شامل کر رکھا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا گھروں میں مطالعہ بھی مفید رہے گا‘ ان شاء اللہ تعالیٰ!

اسی طرح مولانا منظور نعمانیؒ کی ’’معارف الحدیث‘‘ ہے جو احادیثِ مبارکہ کا انتخاب ہے۔ اس میں ایمانیات سے اجتماعی معاملات تک رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے حوالے سے بہت کچھ آ جاتا ہے۔ کچھ واقعات کا ذکر بھی آ جاتا ہے۔ اس کا مطالعہ بھی مفید رہے گا ان شاء اللہ۔

غالباً ۱۹۷۰ء کی دہائی میں رابطہ عالم اسلامی کے تحت عالمی سطح پر سیرت کے حوالے سے ایک مقابلہ ہوا تھا۔ اس میں ۱۷۷ کتب میں سے جو کتاب پہلے نمبر پر آئی وہ ’’الرحیق المختوم‘‘ تھی۔ یہ ہندوستان کے عالم صفی الرحمٰن مبارک پوری کی کتاب ہے۔ ایک ہی جلد میں ہے۔ جس انداز سے حضور ﷺ کی حیات طیبہ آگے بڑھتی رہی‘ اسی ترتیب میں انہوں نے اس کو مرتب کیا۔ ہمارے ہاں بارہا اس کا حوالہ بھی آتا ہے۔ اسے بھی ہم زیر مطالعہ لانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

اس حوالے سے آخری بات انقلابی اعتبار سے سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ ہے۔ ایک ہے فقہ السیرۃ‘ جو اپنی جگہ بڑا اہم موضوع ہے۔ فلاں واقعات کیوں ہوئے‘ یہ فقہ السیرۃ ہے۔ اس پر بھی کام ہونا چاہیے۔ البتہ ایک ہے اللہ کے پیغمبر ﷺ کی ۲۳ سالہ انقلابی جدّ و جُہد۔ اس

انقلابی جدّ و جُہد نے مراحل کیسے طے کیے‘ یہ اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت کا انقلابی نقطہ نگاہ سے مطالعہ ہے۔ اس میں الحمدللہ‘ ثم الحمدللہ استادِ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے جو خطابات اوائل ۱۹۸۰ء کے ہیں‘ ۱۱ خطاباتِ جمعہ وہ ’’منہجِ انقلابِ نبویؐ‘‘ کے عنوان سے کتابی صورت میں موجود ہیں‘ وہ شاہکار ہیں۔ ان کا سن لیا جانا‘ پڑھ لیا جانا انقلابی جدّ و جُہد کے نقطہ نظر سے نہایت مفید ہوگا۔ ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے تھے کہ آج کے دور میں سیرت النبی ﷺ کی اہم ترین رہنمائی یہ ہے کہ اسلامی نظام نافذ کیسے ہوگا! غلبہ دین کی جدّ و جُہد کیسے ہوگی؟ اللہ کا دین بالفعل قائم کیسے ہوگا؟ اس جدّ و جُہد کے لیے راہنمائی کہاں سے لیں گے؟ اگر نماز کا طریقہ رسول اللہ ﷺ سے لے رہے ہیں تو اللہ کے دین کی اقامت کا طریقہ حضور ﷺ سے کیوں نہیں لیتے۔ زندگی کے آخری دور میں محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے لاہور میں ’’رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب‘‘ کے عنوان سے اڑھائی گھنٹے کا خطاب کیا۔ وہ ویڈیو بھی ہے‘ آڈیو بھی اور کتابچہ کی شکل میں بھی ہے۔ اس کا مطالعہ بھی مفید رہے گا‘ ان شاء اللہ تعالیٰ! کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ﷺ کو اور ان کے ذکرِ خیر کو ہم ایک مہینے کے چند دنوں یا چند ساعتوں تک محدود نہ کر دیں‘ بلکہ سیرت کے مطالعے کو ہم اپنے روزمرہ کے معمولات میں شامل کریں۔ اللہ توفیق دے کہ مطالعے سے آگے بڑھ کر اس کا اثر اور عکس ہمارے عمل میں بھی نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین! ❁❁❁

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اشاعت خاص 400 روپے، اشاعت عام 150 روپے

سرکاری ملازمین کا اخلاق و کردار
قرآن وسُنّت کی روشنی میں

امیر تنظیم اسلامی محترم شجاع الدین شیخ کا رورل اکیڈمی پشاور میں خطاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۲۰۸﴾﴾ (البقرۃ)

''اے اہلِ ایمان! اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے' اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔ وہ تو یقیناً تمہارا بڑا کھلا دشمن ہے۔''

تمہیدی بات

پاکستان کے آئین کے آرٹیکل ۳۱ میں درج ہے کہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہاں کے رہنے والوں کے لیے قرآن وسُنّت کی تعلیمات کو سیکھنے اور ان پر عمل کرنے کے مواقع فراہم کرے۔ اس تناظر میں سرکاری ملازمین کی پیشہ ورانہ تربیت میں یہ پہلو بھی سامنے رہنا چاہیے کہ ہماری ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ کے رسول ﷺ کی سُنّت میں کیا تعلیم دی گئی ہے! خوشی کی بات ہے کہ رورل اکیڈمی پشاور میں سرکاری افسران کی تربیت کے ضمن میں قرآن وسُنّت کی روشنی میں اخلاق و کردار کے موضوع پر گفتگو اور سوال و جواب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

اخلاق و کردار کی بہتری کا معاملہ ہم سب کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ پاکستان کے دس اور دنیا کے دس بڑے فراڈ اٹھا لیں' ان میں سے ایک شخص جاہل نہیں ملے گا جس نے اربوں کھربوں کی کرپشن کی ہو۔ انتہائی پڑھے لکھے' اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے پوری قوم کو بیچا اور لوٹا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اخلاق و کردار کا فقدان ہے جو اس وقت پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور ہم

یہ آیت پڑھتے رہتے ہیں' بلکہ اکثر کو زبانی یاد بھی ہے:

﴿لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

''(اے مسلمانو!) تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ) میں ایک بہترین نمونہ ہے۔''

لہٰذا ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔ البتہ وہ نمونہ موجود ہونے کے باوجود کیا آج ہمارا اجتماعی طرزِ عمل اس کی گواہی پیش کر رہا ہے؟ یہ ہے سب سے بڑا سوال۔ اس حوالہ سے سرکاری افسران کے تربیتی کورس میں اس موضوع پر کلام کیا جانا لائق تعریف ہے۔ ذیل میں ۱۲ نکات کے تحت سرکاری ملازمین و افسران کے اخلاق و کردار کے ضمن میں قرآن وسُنّت کی روشنی میں کچھ گزارشات پیشِ خدمت ہیں:

(۱) امانت (Trust)

سرکاری افسر ہونا ایک امانت (trust) ہے نہ کہ استحقاق (privilege)۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کا تعارف کراتے ہوئے ہر رسول سے کہلوایا ہے: ﴿اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ﴾ یعنی میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کو صادق اور امین کہا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آئین کے آرٹیکل ۶۲' ۶۳ کے تحت ہم نے ان اصطلاحات کو کافی بدنام کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ((کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ)) (صحیح البخاری) کہ تم میں سے ہر ایک راعی (بمعنی ذمہ دار) ہے۔ راعی چرواہے کو کہا جاتا ہے۔ چرواہے کو اگر دیکھیں تو اس کی زندگی بڑی اجیرن ہوتی ہے۔ بکری اِدھر بھاگ رہی ہے' بھیڑ اُدھر بھاگ رہی ہے۔ صبح وہ پورا ریوڑ لے کر جائے گا اور شام کو پھر واپس بھی لے کر آنا ہے۔ گویا آرام کا تو موقع ہی نہیں اس کے لیے۔ جانوروں کو سنبھالنا ایک بڑی ذمہ داری ہے اور اگر ایک جانور بھی ضائع ہو جائے تو مہینے بھر کی اجرت ضائع ہو جائے گی۔ بہرحال رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص ذمہ دار ہے' اور جو اُس کے ماتحت ہیں اُن کے بارے میں کل اللہ کے ہاں اس سے سوال ہوگا۔

چنانچہ پہلی بات ہر سرکاری افسر یاد رکھے کہ اس کا منصب ایک امانت ہے نہ کہ استحقاق۔ اب غور کیجیے کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص (sole proprietor) کے ہاں یا کسی نجی ادارہ میں ملازمت کر رہا ہو جہاں دس بارہ دیگر ملازمین بھی ہیں' وہاں اگر اُس سے کوتاہی یا غلطی ہوتی ہے تو

دس بارہ لوگوں کے ادارے یا دکان کا نقصان ہوگا۔ البتہ جو لوگ ریاست کے اداروں میں ملازم ہوں جہاں کروڑوں باشندوں کے ملکی سطح پر‘ کئی کروڑ صوبوں کی سطح پر‘ کئی لاکھ ضلعوں کی سطح پر‘ معاملات سرکاری افسران سے متعلق ہو جائیں تو وہاں اگر کوتاہی یا غلطی ہوتی ہے‘ تو یہ معاملہ صرف دو چار افراد کا نہیں بلکہ لاکھوں اور کبھی کروڑوں کا بن جاتا ہے۔ اس احساس کے ساتھ اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرنا ہے۔ جتنا یہ احساس پختہ ہوگا‘ اللہ تعالیٰ کی قسم ہمارا معاشرہ اتنا ہی بہتر ہو جائے گا۔ آج عوام اچھے معاشرے کے لیے ترس رہے ہیں۔ اچھے کردار اور رویے کے لیے ترس رہے ہیں۔ بے چین ہیں کہ کوئی اچھے انداز سے خوش آمدید کہنے اور معاملہ کرنے کا انداز عوام کو سرکاری دفتر میں ملے۔ مگر درحقیقت معاملہ برعکس ہے کہ افسران اور متعلقہ افراد سے ملنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ان کے کمرہ میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ قطار میں لگنے کے لیے بھی بہت مشقت اٹھانا پڑتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ)) (بیہقی) ’’اُس کا کوئی ایمان نہیں ہے جس میں امانت کا وصف موجود نہ ہو۔‘‘ رسول اللہ ﷺ یہاں ایمان کی نفی کر رہے ہیں۔ یہاں ہمارا محدود تصور لائقِ تشویش ہے کہ ہم نے ایمان کے تقاضوں کو جمعہ کی دو رکعتوں اور پانچ نمازوں تک محدود کر لیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ ہم نے روزہ رکھ لیا‘ حج کر لیا‘ عمرہ کر لیا تو ایمان کے تقاضے پورے ہو گئے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ تو عبادات ہیں جن کو انجام دینا ضروری ہے‘ البتہ یہ کُل دین نہیں ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنا حق تو معاف کر دے گا‘ ہمیں بس بندوں کی فکر کرنی چاہیے۔ یہ جملہ ایک درجے میں ٹھیک ہے مگر مکمل ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس بات کی چھٹی (license to kill) مل جائے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کو پامال کیا جائے۔ قرآن کریم میں سورۃ المدثر کی آیات ۴۲ تا ۴۵ میں قیامت کے دن جنت اور جہنم والوں کے ایک مکالمہ (dialogue) کا ذکر ہے۔ پہلا سوال جنت والے پوچھتے ہیں: ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾﴾ ’’کیا چیز تمہیں جہنم میں لے گئی؟‘‘ تو جہنم والے کہیں گے: ﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ’’ہم نماز ادا کرنے والے نہیں تھے۔‘‘ ﴿وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ’’اور ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے‘‘۔ یہ حقوق العباد ہیں۔ ﴿وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ’’اور ہم (حق کے انکاری) بحث

کرنے والوں کے ساتھ مل کر بحث کرنے میں مشغول رہے۔‘‘ گویا اللہ تعالیٰ کا حق بھی پامال کیا‘ مخلوق کا حق بھی پامال کیا‘ اور اپنے وجود کا حق بھی پامال کیا۔

بہرحال امانت ایک بہت ہی اہم وصف ہے۔ خاص طور پر جن کو ریاستی اداروں میں ذمہ داری مل جائے ان کے لیے امانت کے وصف کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

(۲) پیشہ ورانہ علمی ترقی اور تربیت (Professional Development)

ہر ادارہ اور پیشہ (profession) میں افراد کی تربیت ایک لازمی بات ہے۔ ڈاکٹر‘ انجینئر‘ اساتذہ اور افسران سب ہی کے لیے ان کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے حوالہ سے علمی اضافہ اور پیشہ ورانہ تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل عمل ہے۔ قرآن کریم میں سورۃ بنی اسرائیل‘ آیت ۳۶ میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ یعنی جس بات کا علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔ ایک شخص کوئی عقیدہ اور نظریہ اختیار کرے یا کوئی کام کرے تو قرآن کریم تقاضا کرتا ہے کہ اس کی کوئی علمی بنیاد ہونی چاہیے۔ ہم عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ فلاں کام (job) کے لیے قابلیت (eligibility criteria) ضروری ہے۔ کسی ذمہ داری پر مقرر کرنے کے وقت تو یہ تقاضا پورا ہو جاتا ہے لیکن پھر حالات‘ تقاضوں‘ ذمہ داریوں‘ ٹیکنالوجی وغیرہ کے بدلنے سے علم میں اضافہ اور پیشہ ورانہ تربیت کا اہتمام ضروری ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم اس بات کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے دور میں دیکھیں کہ تورات (تحریف شدہ حالت میں) موجود تھی جو عبرانی (Hebrew) زبان میں تھی۔ مسلمانوں کو یہود سے مباحثہ کرنے کی ضرورت بھی تھی۔ چنانچہ رسول ﷺ نے چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عبرانی سیکھنے کی تلقین فرمائی۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو رسول کریم ﷺ نے اس حوالہ سے دعا بھی دی۔ انہوں نے چند دن ہی میں عبرانی زبان نیز پھر حبشی اور فارسی زبان بھی سیکھی۔ اس کی ضرورت اس لیے تھی کہ اہل کتاب سے گفتگو کرتے ہوئے ان کی کتابوں کا حوالہ بھی آئے گا اور مباحثہ ہوگا۔ نیز ان کو دعوت بھی پیش کرنا تھی جس کے لیے ان کی کتب کے حوالہ سے بھی کلام کرنے کی ضرورت تھی۔ بہرحال اپنی ذمہ داری کے اعتبار سے اپنے علم میں مسلسل اضافے اور پیشہ ورانہ تربیت کی ضرورت ہے۔ اس پر بھی اسلامی تعلیمات میں توجہ دلائی گئی ہے۔

(۳) محاسبہ (Accountability)

ہمارا ایمان ہے کہ جس دنیا میں ہم جی رہے ہیں یہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ ہمیں پلٹ کر اللہ کی طرف جانا ہے۔ کسی کی موت کی خبر پر ہم پڑھتے ہیں: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ''بے شک ہم اللہ کی ملکیت ہیں اور ہمیں لوٹ کر بھی اسی کی طرف جانا ہے۔'' گویا ہم یہ مانے بیٹھے ہیں کہ ہمیں مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ملنی ہے جو دائمی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ علم (knowledge) الگ شے ہے اور یقین (conviction) الگ شے۔ محاسبہ کا یقین سات پردوں میں بھی بندوں کو ٹھیک رکھتا ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور کا مشہور واقعہ ہے جب ایک ماں نے بیٹی سے کہا کہ رات کا وقت ہے' ابھی حضرت عمرؓ نہیں دیکھ رہے تو دودھ میں پانی ملا دو۔ بیٹی نے کہا: اماں! اگر عمرؓ نہیں دیکھ رہے تو کیا ہوا! عمرؓ کا' میرا اور آپ کا رب تو دیکھ رہا ہے!

قرآن کریم پڑھ لیجیے۔ اس کے ایک تہائی حصہ میں آخرت کا ذکر ملتا ہے۔ آج کسی ہیڈ لائن نیوز اور updates میں وہ سوالات نہیں ملیں گے جو ہماری زندگی کے اہم ترین سوالات ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابن آدم کے قدم قیامت کے دن اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکیں گے جب تک وہ پانچ سوالات کے جوابات نہ دے دے: (۱) زندگی کہاں گزاری؟ (۲) جوانی کہاں کھپائی؟ (۳) مال کہاں سے کمایا؟ (۴) مال کہاں خرچ کیا؟ (۵) جو علم حاصل کیا اس پر کتنا عمل کیا؟'' (جامع الترمذی) آج ہمارے ہاں نعرے لگتے ہیں: میرا جسم میری مرضی' It's my style۔ It's my choice۔ میں جو چاہوں سو کروں۔ حالانکہ اسلام کا تو مطلب ہی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے جھکا دینا ہے۔ submitting your will to the will of Allah۔

سورۃ الحشر' آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ ''اور چاہیے کہ تم میں سے ہر ایک یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا تیاری کی۔'' ہمیں تنہائی میں بیٹھ کر سوچنا چاہیے کہ کیا ہم مرنے کو تیار ہیں! ۹۵ فیصد کا جواب ہی نہیں آتا۔ اچھا اگر ہم تیار نہ ہوں تو کیا عزرائیلؑ رک جائیں گے؟ آج ہم سب چاہتے ہیں کہ کرپشن کا خاتمہ ہو۔ کون نہیں چاہتا! جو کرپشن کر رہا ہے جب وہ کسی کرپشن سے ڈسا جائے گا تو وہ بھی کہے گا کہ کرپشن نہیں ہونی چاہیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اپنے لیے ہمارے معیارات (standards) کچھ اور ہیں اور دوسروں

کے لیے کچھ اور۔ اسی لیے بگاڑ ہے۔ اس سب کو اگر ختم کرنا ہے تو سات پردوں میں بھی بیٹی کہے کہ اماں عمرؓ نہیں دیکھ رہے تو کیا ہوا' ان کا رب تو دیکھ رہا ہے۔ بہرحال موت کی یاد اور کل قیامت کے محاسبہ کا جس قدر یقین ہوگا' معاملات اسی قدر بہتر ہوں گے۔

(۴) معاشرتی و معاشی عدل (Social and Economic Justice)

''عدل'' اسلام کا catch word ہے۔ ہم ''انصاف'' کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں' جس کا مطلب ہے نصف نصف کرنا' جبکہ عدل کا مطلب ہے جس کا جو واقعی حق (due right) بنتا ہو وہ اسے دینا۔ خطبہ جمعہ میں ہم ایک آیت سنتے ہیں۔ سورۃ النحل' آیت ۹۰ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ ''اللہ عدل کا حکم دیتا ہے۔'' قرآن کریم عدل پر بہت زور دیتا ہے۔ سورۃ النساء' آیت ۱۳۵ اور سورۃ المائدۃ' آیت ۸ میں یہ فرماتا ہے کہ کسی کی محبت عدل کرنے میں رکاوٹ نہ بنے اور نہ ہی کسی کی دشمنی عدل کرنے سے تمہیں روک دے۔ کئی مرتبہ اداروں اور ماتحت افراد (subordinates) میں کسی سے اگر خوامخواہ ناراضگی یا نفرت ہو جائے تو جو اس کا جائز حق بنتا ہے وہ بھی نہیں دیا جاتا۔ یا اگر کسی سے محبت ہے تو اس کے ساتھ تو کسی بھی طریقہ سے out of the way جا کر بہت کچھ جو اس کا حق بھی نہ ہو' دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ دورِ نبویؐ کا مشہور واقعہ ہے کہ فاطمہ نامی عورت نے چوری کی تھی' جو بڑے قبیلے کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کاٹنے کا حکم جاری فرمایا۔ معافی کے حوالہ سے بڑی بڑی سفارشیں آئیں۔ اس پر غصے کی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''دیکھو پچھلی قومیں اس لیے برباد ہوئیں کہ ان کا کوئی بڑا جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیتے' اگر کوئی چھوٹا جرم کرتا تو اسے سزا دیتے۔'' پھر فرمایا: ''بالفرض اگر میری بیٹی فاطمہ نے بھی یہ معاملہ کیا ہوتا تو اس کے بارے میں بھی مَیں یہی حکم جاری کرتا۔'' (سنن نسائی) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف عدل کی باتیں نہیں کہیں' بلکہ عدل کی بنیاد پر بالفعل ایک معاشرہ قائم کر کے بھی دکھا دیا۔

عدل کا ایک سادہ مفہوم ہے کسی شے کو اس کے مقام پر رکھنا۔ عدل کی ضد (opposite) ظلم ہے۔ ظلم کا مطلب ہے کسی شے کو اس کے مقام سے ہٹا دینا۔ ہم اپنے گھروں' رشتہ داروں اور اداروں میں دیکھ لیں۔ اولاد' رشتہ دار اور ماتحت افراد کے ساتھ رویوں اور عوام الناس سے معاملہ (public dealing) کرتے ہوئے کسی ایک کے ساتھ بے جا طرف داری اور نفع رسانی

(undue favour) جبکہ کسی دوسرے کے ساتھ زیادتی اور حق تلفی تو نہیں کر رہے؟ فلاں پسند ہے‘ رشتہ دار ہے‘ فائدہ پہنچاتا ہے تو اس کے ساتھ عمدہ سلوک بلکہ حق سے بڑھ کر معاملہ اور دوسرے کا جائز حق بھی نہ دیا جا رہا ہو تو یہ ظلم ہے۔ چنانچہ عدل ہے کسی شے کو اس کے مقام پر رکھنا اور ظلم ہے کسی شے کو اس کے مقام سے ہٹا دینا۔ بہرحال ظلم‘ حق تلفی اور زیادتی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہی ہونی ہے اور یاد رہے کہ حقوق العباد کا معاملہ بہت حساس بھی ہے۔

(۵) شفافیت (Transparency)

مالی معاملات‘ سرکاری دفاتر‘ عوامی امور میں شفافیت کا ہونا فطری اور اخلاقی تقاضا ہونے کے ساتھ دینی تقاضا بھی ہے۔ قرآن کریم کی طویل ترین آیت (سورۃ البقرۃ‘ آیت ۲۸۲) قرض جیسے اہم مالی معاملہ کے موضوع پر ہے۔ شفافیت کا تقاضا ہے کہ ایک سرکاری افسر چونکہ عوامی منفعت (public interest) کے حوالے سے ذمہ دار ہے اور اس کو ملنے والی تنخواہ اور مراعات حکومتی وسائل (جن کا بڑا حصہ عوام کے ٹیکس سے حاصل ہوتا ہے) سے دی جاتی ہیں تو اس کے معاملات خاص طور پر مالی معاملات کو پبلک ہونا چاہیے۔ یہ عوام کا ایک حق بھی ہے اور سرکاری امور کو شفافیت سے انجام دینے کے لیے بھی ضروری ہے۔

خلیفہ وقت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ایک صاحب نے بھرے مجمع میں دورانِ خطبہ کہا کہ آپ کی بات نہ سنیں گے نہ مانیں گے! غور کیجیے کیا آزادیٔ تقریر (freedom of speech) ہے! سیدنا عمرؓ نے دریافت فرمایا: کیوں نہیں سنو گے اور کیوں نہیں مانو گے؟ ان صاحب نے استفسار کیا: آپ یہ بتائیں کہ جو لباس آپ نے پہنا ہوا ہے اس کا اتنا کپڑا آپ کے پاس کہاں سے آیا! مالِ غنیمت میں ہم سب کو جو کپڑا ملا وہ اتنا نہیں تھا کہ ہمارے پورے جسم کو ڈھانپ لے‘ تو اس سے آپ کا لباس کیسے بن گیا؟ (سیدنا عمر رضی اللہ عنہ وسیع اور مضبوط جسامت والے تھے)۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ نے صحیح سوال کیا ہے۔ پھر اپنے بیٹے سے فرمایا کہ آپ جواب دیجیے۔ بیٹے نے عرض کی کہ میں نے اپنے حصے کا کپڑا والد صاحب کو دے دیا تھا‘ تب ان کا لباس تیار ہوا۔ یہ وضاحت ہونے کے بعد ان صاحب نے عرض کی: اب ہم آپ کی بات سنیں گے بھی اور مانیں گے بھی۔ کیا آج ہمارے سرکاری افسران کے مالی و دیگر معاملات ایسے شفاف ہیں؟ کیا سرکاری افسران کا ریکارڈ عوام کے لیے شفافیت کی غرض سے پیش کیے جانے کا معاملہ سرکاری

اداروں کی ترجیحات میں شامل ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حیاتِ طیبہ کے آخری ایام میں ایک مرتبہ منبر پر کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معصوم اور خطاؤں سے پاک تھے‘ تاہم فرمایا کہ اگر میں نے کسی سے کچھ زیادتی کا معاملہ کیا ہو تو آئے اور مجھ سے بدلہ لے لے۔ خیال رہے کہ امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ریاست کے حکمران بھی تھے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ایک مرتبہ صفیں درست کراتے ہوئے آپ سے ایک چھڑی میرے جسم پر لگ گئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آؤ بدلہ لے لو۔ انہوں نے عرض کی: اس وقت میرے جسم پر قمیص نہیں تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قمیص ہٹا دی۔ وہ دوڑتے ہوئے آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں شانوں کے درمیان جو مہر نبوت تھی‘ اسے چوم لیا اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے تو اس مہر نبوت کو چومنا تھا۔ یہ تو ان کی محبت اور شوق کا معاملہ تھا‘ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل دیکھیے کہ اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ ہم غور کریں کہ عوام‘ ماتحت افراد اور دیگر لوگ تو دور کی بات‘ کیا ہم اپنے آپ کو اپنے اہل خانہ کے سامنے بھی پیش کر سکتے ہیں؟ اگر یہ بہت مشکل محسوس ہوتا ہے تو غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں گے تو کیا کیفیت ہوگی! لہٰذا ہمارے مالی معاملات‘ کردار اور اختیارات کے استعمال سب میں شفافیت ضروری ہے۔

(۶) باہمی مشاورت (Mutual Consultation)

مشورہ انسانی ضرورت بھی ہے اور اجتماعی معاملات کے لیے لازم بھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر والوں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے مشورہ فرماتے تھے۔ سورۂ آل عمران‘ آیت ۱۵۹ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ یعنی ان سے معاملات میں مشورہ کیجیے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشورہ کی تلقین فرمائی گئی ہے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل رہنمائی عطا ہوتی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی مرتبہ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا‘ مثلاً غزوۂ بدر میں اپنا خیمہ نصب کرنے اور غزوۂ اُحد کے موقع پر مدینہ شریف میں رہ کر یا باہر نکل کر کفارِ مکہ کا مقابلہ کرنے کے بارے میں مشورہ فرمایا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زوجہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے مشورہ پر احرام کھول دیا تو ۱۴۰۰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنا احرام کھول دیا تھا (ان واقعات کی تفصیلات

سیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں)۔ اس میں اُمّتِ مُسلمہ کے لیے راہنمائی ہے کہ اپنے باہمی معاملات مشورہ سے طے کریں۔ سورۃ الشوریٰ' آیت ۳۸ میں فرمایا گیا کہ ﴿وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ﴾ ''اوران (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔''

مشاورت کا ایک اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جن سے مشورہ لیا جارہا ہے ان کو احساس ہوتا ہے کہ ہماری بھی اہمیت ہے کہ معاملات اور فیصلوں میں ہم سے بھی رائے لی جاتی ہے۔ ایک اور اہم فائدہ یہ ہے کہ ماتحت افراد مختلف امور اور فیصلوں کے بارے میں اپنے آپ کو منسلک سمجھتے اور ownership بھی لیتے ہیں۔ یوں اجتماعی طور پر team work سے کام ہوتا ہے۔ یہ سارا عمل سرکاری افسران کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ ہم غور کریں کہ کیا ہم گھر والوں سے' اپنے بچوں اور اہلیہ سے مشورہ کرتے ہیں؟ اپنے ماتحت افراد سے مشورہ کرتے ہیں؟ کہیں اپنے علم' تجربہ اور صلاحیتوں پر ناز کرتے ہوئے مشورہ کرنے سے اعراض تو نہیں کرتے؟ تکبر بہت برا مرض اور جرم ہے۔ شیطان بھی اسی کا شکار ہوکر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہوگیا تھا۔ کوئی عقلِ کُل نہیں ہوتا۔ معاملات اور فیصلوں میں مشاورت لازمی ہوتی ہے۔ مشورہ کرکے ہم اپنے ماتحت افراد کو ساتھ لے کر چلتے اور on board رکھتے ہیں' جس کی ہماری ذمہ داریوں کی ادائیگی میں شدید ضرورت ہے۔

(۷) اخلاقی رویّہ (Moral Conduct)

اخلاق کا لفظ خُلق سے بنا ہے۔ ایک لفظ ہے خَلق' خ پر زبر کے ساتھ۔ ایک لفظ ہے خُلق' خ پر پیش کے ساتھ۔ خَلق کا معنی ہے پیدا کرنا۔ اسی سے مخلوق اور تخلیق جیسے الفاظ ہیں۔ چنانچہ خَلق ہمارا ظاہری وجود ہے اور خُلق ہمارا باطنی معاملہ اور اخلاقی رویہ ہے۔ تو خَلق جسمانی وجود ہے اور خُلق ہمارا کردار ہے۔ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں ایمانیات و عبادات کے ساتھ اخلاقیات پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ ۝۴﴾ (القلم) ''اور آپ (ﷺ) اخلاق کے بلند ترین مرتبہ پر فائز ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو بندہ عمدہ اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے وہ اس شخص کا مقام پالیتا ہے جو روزانہ رات کو نوافل اور دن میں نفلی روزہ رکھتا ہو۔'' (سنن ابی داؤد)

آج ہمارے معاشرے بلکہ دنیا کی مجموعی صورتِ حال بہت پریشان کن ہے۔ جھوٹ' وعدہ خلافی' خیانت' رشوت' کرپشن' ملاوٹ' ظلم و زیادتی' اختیارات کا ناجائز استعمال وغیرہ عام ہے۔ سرکاری افسران اور ذمہ داران کو اس حوالہ سے بھی توجّہ دینے کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم سورۃ الحجرات' آیات ۱۱ اور ۱۲ میں معاشرتی برائیوں سے منع فرماتا ہے جو ہمارے ہاں بہت عام ہیں۔ مذاق اڑانا' لعن طعن کرنا' دوسروں کے برے نام رکھنا' بدگمانی کرنا' دوسروں کی ٹوہ میں لگنا اور ان کی غیبت کرنا۔ یہ برائیاں نفرتوں کو جنم دیتی ہیں اور معاشرہ تباہی کا شکار ہوجاتا ہے۔ inside information' character assassination اور backbiting جیسے منفی اخلاقی رویے اداروں میں عام ہیں جن کی نحوست اور مضر اثرات معروف بھی ہیں۔

ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ مؤمن وہ ہے جسے دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آئے (جامع ترمذی)۔ اس کی تشریح میں یہ بات سمجھ لی جائے کہ اُمتی وہ شخص ہوگا جس کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ یاد آجائیں۔ غور طلب بات ہے کہ کیا آج ہمارے اخلاقی رویوں کو دیکھ کر لوگوں کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ یاد آتے ہیں! ہم اپنے کردار سے کیا پیغام پہنچا رہے ہیں؟ سچی بات ہے کہ خوفِ خدا اور نبی کریم ﷺ کے اُمتی ہونے کا احساس ہو تو کیا بندہ رشوت لے گا؟ حرام کو ہاتھ لگائے گا؟ خیانت کا مرتکب ہوگا؟ کسی کی حق تلفی کرے گا؟ یقیناً جواب نفی میں ہوگا۔ چنانچہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ اخلاقی رویہ کے اعتبار سے ہمارا طرزِ عمل کیسا ہے!

(۸) احسان (Excellence)

احسان کا لفظ حسن سے بنا ہے جس میں حسین اور عمدہ انداز سے کسی کام کو انجام دینے کا مفہوم شامل ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے excellence کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ البتہ عربی کے لفظ احسان میں بہت گہرا مفہوم موجود ہے۔ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں یہ لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے۔ نماز کے بعد کی دعاؤں میں ایک دعا ہے: اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلٰى ذِكْرِكَ وَ شُكْرِكَ وَ حُسْنِ عِبَادَتِكَ ''اے اللہ! میری مدد فرما اپنے ذکر کے لیے اور اپنے شکر کے لیے اور حسن کے ساتھ اپنی عبادت کے لیے۔'' (سنن ابی داؤد) حسن کا مطلب ہے عمل کو بہترین انداز میں انجام دینا۔ مشہور حدیث میں ''احسان'' کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو' اور یہ یقین حاصل نہ ہو تو اتنا تو مانو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ (متفق علیہ)

اگر ایک boss آفس میں ہے تو ہمیں معلوم ہے کہ ملازمین خوب محنت سے کام کرتے ہیں اور اگر وہ آفس میں نہ ہو تو کارکردگی کی کیفیت کیسی ہوتی ہے‘ ہمیں خوب معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ تو پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اگر یہ یقین ہو تو ہمارے رویے میں کتنا حسن آجائے گا۔ ایک حدیث مبارکہ میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: قاتل کو بھی قتل کرو تو حسن کے ساتھ اور بکری کو بھی ذبح کرو تو حسن کے ساتھ۔ یعنی قاتل رحم کا مستحق نہیں مگر اسے بطور سزا قتل اس انداز میں کرو کہ تکلیف کم سے کم ہو۔ اگر اس کی گردن اڑاؤ تو جلاد کا ہاتھ مضبوط اور تلوار کی دھار تیز ہو تاکہ اس کو تکلیف کم ہو۔ بکری گو کہ جانور ہے مگر اسے بھی حسن کے ساتھ یعنی عمدہ انداز میں ذبح کرو۔ کھلا پلا کر ذبح کرو۔ ہاتھ مضبوط ہو‘ چھری تیز ہو‘ کسی اور تڑپتے جانور کے سامنے ذبح نہ کرو۔ یہ ہے حسن کا وسیع مفہوم کہ کاموں کو عمدہ انداز سے انجام دو۔ جو دین قاتل اور جانور کے معاملے میں حسن اختیار کرنے کی تعلیم دے رہا ہے‘ وہ ریاست کے امور‘ اجتماعی معاملات‘ قوم کو خدمات فراہم کرنے والے اداروں کے رویوں میں حسن کا کتنا تقاضا کرتا ہوگا!

(۹) خدمتِ خلق (Social Welfare)

مخلوقِ خدا کے کام آنا فطری تقاضا اور دینی فریضہ ہے۔ سرکاری ملازمین کے لیے بہت سے مواقع ہوتے ہیں جہاں وہ لوگوں کے کام آکر ان کے لیے راحت کا باعث بن سکتے ہیں۔ وہ تمام امور جو قوم اور عوام سے متعلق ہیں‘ ان کو واقعتاً احسان کے ساتھ ادا کریں تو لوگوں کا بھلا ہوگا۔ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنا تو ضروری ہے ہی‘ البتہ اس کے ساتھ خدمت کے بھی کئی مواقع ہوتے ہیں۔ عوامی خدمت کے اداروں میں کئی مثالیں ایسی دی جاسکتی ہیں جہاں سرکاری افسران اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے دوران لوگوں کی رہنمائی‘ صحیح معلومات کی فراہمی‘ صحیح فرد یا دفتر تک رسائی‘ مفید مشوروں اور دیگر انداز میں عوام بالخصوص بزرگ‘ معذور اور کم پڑھے لکھے افراد کی سہولت کا باعث بن سکتے ہیں۔

ایک حدیث مبارک میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((هَلْ تُنْصَرُوْنَ وَ تُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ)) (صحیح بخاری) یعنی تمہارے کمزوروں کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہیں رزق دیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری عقل‘ قوتِ بازو‘ قابلیت اور تجربہ کی بنیاد پر ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے۔ حالانکہ یہ مشاہدہ ہے کہ بعض نہایت

تعلیم یافتہ قابل افراد ملازمت کی تلاش میں پریشان رہتے ہیں جبکہ کئی غیر تعلیم یافتہ افراد لاکھوں کروڑوں کے مالک بنے ہوتے ہیں۔ یہ تو بہرحال اللہ تعالیٰ کی تقسیم ہے‘ البتہ محنت ضرور کرنی ہے‘ اس میں کوئی شک نہیں۔ تاہم یہ حدیث مبارک بتا رہی ہے کہ کمزوروں کی وجہ سے تمہیں مدد اور رزق دیا جاتا ہے۔ بوڑھے والدین‘ چھوٹے بچے‘ خاندان کے بزرگ افراد‘ کوئی یتیم و مسکین یا دیگر ضرورت مند وغیرہ کے کام آجانا‘ ان کے لیے راحت کا باعث بننا‘ آسانی فراہم کرنا‘ کسی مظلوم کی دادرسی کی کوشش کرنا اور کسی ضرورت مند کا جائز حق دلوانے کی کوشش کرنے جیسے اعمال خدمت خلق ہی کی شکل ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت فرمائے گا: اے میرے بندے! مَیں بھوکا تھا‘ تُو نے مجھے کھلایا نہیں‘ مَیں پیاسا تھا‘ تُو نے مجھے پانی نہ پلایا‘ مَیں بیمار تھا‘ تُو نے میری عیادت نہیں کی‘ اور میں بے لباس تھا‘ تُو نے مجھے لباس نہ دیا۔ بندہ عرض کرے گا: اے اللہ! تُو ربّ العالمین ہے‘ تجھے ان چیزوں سے کیا واسطہ! اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ بھوکا تھا‘ پیاسا تھا‘ بیمار تھا اور بے لباس تھا۔ اگر تُو نے اسے کھلایا ہوتا‘ تُو نے اسے پانی پلایا ہوتا‘ تُو نے اسے لباس دیا ہوتا اور تُو نے اس کی تیمارداری کی ہوتی‘ تو تُو مجھے پالیتا۔ (صحیح مسلم) مخلوقِ خدا کی خدمت کو اللہ تعالیٰ اپنی رضا کے حصول کا ذریعہ بتا رہا ہے۔ اندازہ کیجیے کہ ہمارے دین میں خدمت خلق کی کیا اہمیت ہے۔ البتہ افسوس ہے کہ اس کا تصور بھی اب غیروں سے سیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۱۰) ماتحت افراد سے برتاؤ (Dealing with Subordinates)

اجتماعی امور خصوصاً سرکاری اداروں میں ایک اہم معاملہ ماتحت افراد کے ساتھ برتاؤ اور رویہ کا ہے۔ اداروں میں نظم وضبط (discipline) برقرار رکھنا ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ محکمانہ قوانین (code of conduct) پر عمل کروانا بھی لازم ہے۔ اس میں دو رائے نہیں۔ تاہم اپنے عہدہ کی بنیاد پر ماتحت کو حقیر سمجھنا اور ان کی تذلیل (degrade) کرنا انتہائی غیر اخلاقی بات ہے۔ یہ تکبّر ہے کہ کسی کو تعلیم‘ مہارت یا تجربہ میں کم سمجھ کر یا کمی کوتاہی پر نازیبا کلمات (comments) کہہ دینا یا عزّتِ نفس کو مجروح کرنا۔ اخلاقی و دینی لحاظ سے یہ بہت غلط بات ہے۔ آبرو اور عزّتِ نفس ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور حساس معاملہ بھی۔ خطبہ حجۃ الوداع میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جیسے عرفہ کا دن‘ ذوالحجہ کا مہینہ اور یہ شہر (مکہ) حرام (یعنی

محترم) ہے‘ ایسے ہی تم پر ایک دوسرے کی جان و مال اور آبرو بھی حرام ہے۔‘‘ (سنن ابن ماجہ)

عزّتِ نفس تو چھوٹے سے بچے میں بھی ہوتی ہے۔ بڑوں کا معاملہ زیادہ حساس ہے۔ ماتحت افراد کو ان کی ذمہ داری‘ تنخواہ‘ گریڈ‘ مالی کمزوری وغیرہ کی بنیاد پر مذاق یا تذلیل کا نشانہ بنانا تکبّر کا اظہار ہے۔ قوانین کی پاس داری اصولی طور پر لازمی ہے مگر عزت نفس کو پامال کرنا‘ برے الفاظ کہنا‘ بے عزت کرنا‘ تذلیل کرنا اور کردار کشی کرنا حرام ہے۔ یہ شے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کو دعوت دے سکتی ہے۔ اس کے برعکس ماتحت افراد کے ساتھ بہتر رویہ‘ دل جوئی اور غم خواری سے ان کا دل جیتا جاسکتا ہے۔ ذمہ دار (boss) اور ماتحت کا فرق اور ادارہ جاتی قوانین کی پاس داری تو اپنی جگہ رہے گی مگر اس عمدہ اخلاقی رویہ سے ہم اپنے ماتحت افراد کو ان کاموں میں شریک (on board) اور متحرک کرسکیں گے جو ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اس کا مثبت اثر ادارے کی کارکردگی اور عوام کی فلاح پر بھی لازماً ہوگا۔ ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں کہ سرکاری افسران نے اپنے ماتحت افراد کے ساتھ عمدہ رویوں کی مثالیں قائم کی ہیں جن میں ماتحت افراد کو سلام میں پہل‘ خوشی وغمی میں شرکت‘ ضرورت میں ممکنہ حد تک کام آنا اور کبھی دفتر میں کھانے میں انہیں شریک کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

(۱۱) آسانی فراہم کرنا (Creating Ease)

سرکاری اداروں کے اکثر کام عوام سے براہِ راست متعلق ہوتے ہیں۔ عوام کی بہبود ان اداروں کی ذمہ داری ہے۔ ایسے میں لوگوں کو مشکلات سے بچانا اور آسانی فراہم کرنا ذمہ داری بھی ہے اور دینی تقاضا بھی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ آسانی کرو اور سختی نہ کرو (صحیح بخاری)۔ کئی مرتبہ کا مشاہدہ اور عام شکایت بھی ہے کہ اکثر سرکاری اداروں میں لوگوں کو انتہائی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ کئی مرتبہ جائز کام بھی جائز طریقہ سے نہیں ہو پاتے۔ متعلقہ عملہ کئی مرتبہ سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ لوگوں کے کاموں میں بلاوجہ رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عوام قطار میں لگے انتظار کر رہے ہوتے ہیں‘ جس میں کبھی کھلے آسمان تلے اور دھوپ میں بے زاری کی حالت میں بھی کھڑے رہنا پڑتا ہے‘ مگر متعلقہ افسران یا عملہ آپس میں گفتگو‘ چائے یا کھانے پینے‘ موبائل فون پر بات کرنے‘ کبھی اسکرین پر کرکٹ میچ دیکھنے اور نجی کاموں میں مصروف ہوتا ہے اور عوام بے چارے سڑ رہے ہوتے ہیں۔ اذیت کا یہ رویہ گناہ اور

زیادتی بھی ہے اور سرکاری امانت میں خیانت بھی۔ اس کے نتیجہ میں لوگوں کی بددعائیں ملنے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لینے کا قوی اندیشہ ہے۔ اس کے برعکس اپنی ذمہ داری کو ادا کرنا تو ضروری ہے ہی مگر لوگوں کا حق ادا کرنے کے ساتھ ان سے بھلا سلوک اور ان کے لیے آسانی فراہم کرنا باعثِ اجر بھی ہے اور آخرت میں بہت بڑا سہارا بھی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ’’جو آج کسی مشکل میں مبتلا شخص کے لیے آسانی فراہم کرے گا‘ اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں آسانی فراہم کرے گا۔‘‘ (صحیح مسلم)

(۱۲) حرام مال سے بچنا (Avoiding Haram Earning)

آخری مگر ایک اہم ترین بات ہے مالِ حرام سے بچنے کی کوشش کرنا۔ حلال کمانے کی کوشش کرنا فرض ہے اور دین نے اس کی تاکید بھی فرمائی ہے۔ کردار اور اعمال پر مالِ حلال کے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ سورۃ المؤمنون‘ آیت ۵۱ میں ارشاد ہے: ﴿يَآيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ ’’اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک اعمال کرو۔‘‘ اندازہ کیجیے کہ رسولوں کو پاکیزہ کھانے کا حکم دیا جا رہا ہے‘ جو کہ دراصل اُمتیوں کے لیے راہنمائی ہے۔ ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ نیک اعمال کا ذکر پاکیزہ کھانے کے بعد کیا گیا ہے۔ گویا مالِ حلال کا نتیجہ نیک اعمال کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کے برعکس مالِ حرام بے سکونی‘ بے اطمینانی‘ جرائم‘ کردار کے بگاڑ اور فساد کا ذریعہ بنتا ہے۔

آج معاشرہ میں مالِ حرام کی کئی شکلیں عام ہیں جو کئی مرتبہ سرکاری اداروں اور سرکاری افسران کے معاملات میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ رشوت‘ کمیشن‘ کرپشن‘ قبضہ مافیا‘ اختیارات کا غلط استعمال‘ اقربا پروری‘ حق تلفی‘ دھوکا دہی وغیرہ جیسی مالِ حرام کی کتنی ہی شکلیں بکثرت موجود ہیں۔ مالِ حرام جہنم کے انگارے ہیں جن سے کردار‘ نسلیں اور سب سے بڑھ کر آخرت برباد ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ’’حرام مال سے پلا ہوا جسم جنت میں داخل نہ ہوگا۔‘‘ (صحیح مسلم)۔ ایک دوسری حدیث مبارکہ میں ہے کہ وہ جسم جہنم کا مستحق ہے جو مالِ حرام سے پلا ہو۔ (مسند احمد)

غور کیا جائے کہ حرام ذرائع آمدن سے کمائی گئی دولت جنت سے محرومی اور جہنم میں داخلہ کا باعث بنے گی۔ انسان قبر میں صرف کفن پہن کر جاتا ہے اور اس میں جیب بھی نہیں ہوتی۔ آج

کوئی لوگوں سے بچ کر حرام کی دولت کما بھی لے تو اللہ تعالیٰ سے چھپنا اور بچنا ممکن نہیں۔ پھر مالِ حرام کمانے والا اپنے ساتھ اپنے زیرِ کفالت اہلِ خانہ کو بھی حرام کے استعمال میں مبتلا کرتا ہے اور یوں مزید گناہوں کا بوجھ اپنے سر لیتا ہے۔ اس کے برعکس مالِ حلال سکون و اطمینان‘ نیک اعمال‘ اجر و ثواب اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا باعث بنتا ہے۔

حرفِ آخر

گزشتہ صفحات میں سرکاری ملازمین و افسران کے لیے اخلاق و کردار کے ضمن میں قرآن و سنّت کی روشنی میں ۱۲ نکات کے تحت کچھ باتیں بیان کی گئیں۔ اب آخر میں مملکت خداداد پاکستان‘ ہماری دینی ذمہ داریوں اور آخرت کے بارے میں کچھ باتیں پیش خدمت ہیں۔ یہ ملک پاکستان ہمیں بڑا محبوب ہے۔ ’’پاکستان کا مطلب کیا: لا اِلٰہ اِلّا اللہ‘‘ کے نعرہ پر اسے حاصل کیا گیا۔ لاکھوں افراد نے اس کی خاطر قربانیاں دیں اور ہجرت کی۔ علامہ اقبال کا خواب تھا کہ مسلمانوں کا ایک علیحدہ خطہ زمین ہو جہاں وہ اسلامی شریعت نافذ کر سکیں۔ قائداعظم کا ویژن تھا کہ اس ملک میں عہدِ حاضر کی اسلامی فلاحی ریاست قائم کی جائے۔ نبی کریم ﷺ کے اُمتی ایک بڑے مشن کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور نبی کریم ﷺ کی نمائندگی کرنی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس مملکت خداداد میں اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم اور نافذ کیا جائے جو نبی کریم ﷺ کا ۲۳ برس کا مشن تھا۔

دینِ اسلام صرف نمازوں‘ روزوں اور صدقہ و خیرات ہی کا نام نہیں ہے۔ یہ مکمل نظامِ زندگی ہے اور انفرادی کے ساتھ اجتماعی معالاتِ زندگی میں بھی اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ غور کریں آج ہم سیاسی سطح پر کتنے ابتر ہیں! ہماری معاشی حالت کس قدر بربادی کا شکار ہے! ہماری معاشرتی کیفیات ساری دنیا کو معلوم ہیں۔ ہمارا نظامِ تعلیم تباہی کا شکار ہے۔ ہماری اخلاقی گراوٹ پستی کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ ہمارے پاسپورٹ کی قدر دنیا میں کیسی ہے؟ کرپشن میں ہمارا نمبر کیا ہے؟ ہماری عدلیہ دنیا میں کس درجہ پر ہے؟ ہماری افرادی قوت کو کچھ ملک کیوں واپس بھیج رہے ہیں؟ یہ اور بہت سارے مسائل کا پہاڑ ہم پر مسلّط ہے۔ ان سب باتوں کے بہت سے ضمنی اسباب ہیں البتہ سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم ایک نظریاتی ریاست ہیں جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی۔ اگر نظریہ مضبوط نہ ہوگا تو ریاست کا استحکام ممکن نہیں۔

مسائل کا شکار لاکھوں لوگ مایوس ہو کر پاکستان سے باہر جا رہے ہیں۔ البتہ سوال یہ ہے کہ بڑی سوچ کے ساتھ فکر کون کرے گا؟ اپنی ذات اور گھر والوں سے بڑھ کر اس مملکت خداداد کا بھی تو سوچیں جس کو ہم نے اللہ تعالیٰ کے نام پر حاصل کیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ عرض ہے کہ ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر بندے کو منفرد (unique) بنایا ہے۔ سرکاری افسران اور عہدہ داران تو بہت سا اختیار بھی رکھتے ہیں اور لوگوں پر اثر انداز بھی ہو سکتے ہیں۔ اپنے اہل خانہ‘ ماتحت افراد‘ دوست احباب اور دیگر ملنے جلنے والے افراد کے حوالے سے کچھ ایسا کر جائیں کہ کل اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہو اور رسول اللہ ﷺ کا سامنا ہو تو شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

اس ضمن میں ایمان کی محنت‘ خوفِ خدا‘ بڑا مشن سامنے رکھنا‘ خود اللہ کا بندہ بننا‘ دوسروں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دینا اور اس زمین پر اللہ کے دین کو نافذ کرنے کی جِدّ و جُہد کرنا ضروری ہے جس کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا۔ آئندہ کا لائحہ عمل (way forward) کیا ہوگا‘ یہ اگلی بات ہے۔ آج ہم سوچ‘ فکر اور vision تو بڑا رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت‘ مخلوقِ خدا کی خدمت اور آخرت کی فکر کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ دنیا جیسی حقیر شے بھی ہمارے قدموں میں ڈال دے گا۔ بس اس بڑی سوچ کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں ہی ہماری دنیا اور آخرت کی فلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ❁❁❁

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل
خلافت کی حقیقت
اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام
ڈاکٹر اسرار احمدؒ
اشاعت خاص 450 روپے، اشاعت عام 300 روپے

مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

ایوب بیگ مرزا

پاکستان کا معاشرہ یوں تو بہت سے معاملات میں تضادات کا ملغوبہ ہے لیکن خاص طور پر دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ حیثیت کے حوالے سے معاشرے میں بُعد المشرقین واضح دکھائی دیتا ہے۔ عام شہری اور کم پڑھے لکھے لوگ اسلام کا ذکر کر کے آسمانوں پر اُڑتے نظر آتے ہیں جبکہ پڑھا لکھا طبقہ اور خاص طور پر وہ لوگ جنہیں ایلیٹ کہا جاتا ہے یا سمجھا جاتا ہے وہ اسلام کا نام لینے سے تو ڈرتے ہیں لیکن اپنا سارا غصہ مسلمانوں کا کاندھا استعمال کر کے نکالتے ہیں۔ راقم کے ذہن میں اس وقت خاص طور پر ٹیلی ویژن کے ایک بڑے اینکر ہیں جن کی ہر بات کی تان اس بات پر ٹوٹتی ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی حیثیت کیا ہے' انہوں نے آج تک کیا کیا ہے' سب کچھ مغرب نے ایجاد کیا! بتائیں مشرق کے لوگوں نے کیا بنایا؟ کیا انہوں نے کبھی کوئی تحقیقی کام کیا؟ سب کچھ مغرب سے لیتے ہیں' اُسی کی ایجادات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اِن کے پاس خالی خولی باتیں کرنے اور نعرہ زنی کے سوا کیا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مغرب کی ترقی کا بھرپور ذکر کرتے ہیں اور مشرق خاص طور پر اپنے معاشرے کو مفلوج قرار دیتے ہیں۔

راقم کی رائے میں دونوں طبقات انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دو چیزوں کے تقابل کے لیے انتہائی اہم اصولوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ عام شہری صرف یہ جانتا اور سمجھتا ہے کہ ''پدرم سلطان بود'' اور آج کے زمینی حقائق کو نظر انداز کرتا ہے جبکہ معاشرے کا وہ حصہ جو مغرب سے متاثر ہے اور وہاں کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کا تعلیم یافتہ ہے' وہ صرف موجودہ حالات کو دیکھتا ہے۔ مغرب کی اقتصادی اور عسکری ترقی پر نظر رکھتا ہے اور سمجھتا ہے یا کم از کم ایسا تاثر دیتا ہے جیسے مغرب ازل سے ہی دنیا پر چھایا ہوا ہے اور ابد تک رہے گا۔ اُس کے مطابق مغرب مشرق سے خاص طور پر مسلمانوں سے اِس قدر آگے نکل چکا ہے کہ اب اُسے پکڑا نہیں جا سکتا۔ وہ تاریخ یعنی ماضی پر نظر دوڑانا ضروری نہیں سمجھتا اور نہ ہی مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہماری رائے میں نہ صرف تاریخِ عالَم پر گہری نگاہ ڈالنے سے بلکہ آج کے حالات کو دیکھ کر اگر مستقبل کا تانا بانا بُنا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ماضی میں بھی مغرب کی نسبت مشرق زیادہ عرصہ تک دنیا میں حاوی رہا اور مستقبل بھی آخر کار مشرق ہی کے نام ہوگا۔ راقم نے مشرق کے غلبہ کے حوالے سے جو لفظ ''آخر کار'' استعمال کیا ہے اس کا مطلب ہے کہ دنیا کے اختتام سے پہلے مشرق کا غلبہ یقینی ہے' البتہ اُس سے پہلے اور بہت پہلے مغرب حاوی نظر آ سکتا ہے' بلکہ زمینی حقائق کے مطابق نظر آ رہا ہے۔ ہمیں اِس بات کا اعتراف ہے کہ مشرق کے غلبہ کے حوالہ سے جذباتیت کا عنصر کارفرما ہو سکتا ہے اور شاید خواہش نے بھی تبصرے کی شکل اختیار کر لی ہو' لیکن کچھ عقلی اور منطقی دلائل کے ساتھ مذہبی و روحانی جذبات کا بھی اس میں بھرپور دخل ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم! ایک بات تو سب کے سامنے ہے کہ علامہ اقبال جو بیک وقت فلسفی' مفکّر اور دانشور بھی تھے اور فکرِ قرآنی کے اعلیٰ درجہ کے معلّم بھی' ان کی سیاسی پختگی کا یہ عالَم تھا کہ جناح کی انگلی پکڑ کر انہیں ہندوستان واپس لائے اور بتایا کہ ہند کے مسلم کی تحریکی رگ کو کیسے چھیڑا جائے۔ وہ علامہ اقبال جب کہتے ہیں کہ ع ''مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!'' تو اُس وقت کے مشرق کے حالات آج سے کہیں بدتر تھے۔ مشرق کے اکثر ممالک مغرب کے قبضہ یا کنٹرول میں تھے۔ مشرقی اور اسلامی دنیا کا معاملہ ایک جیسا ہی نظر آتا تھا۔ چہار سُو اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ عام آدمی تو ایک طرف' بڑے بڑے دانشور اور علماء انتہائی مایوسی کے عالَم میں تھے۔ سرسید جیسے دانشور اور نیم عالم دین انگریز کی حاکمیت اور برتری کو مکمل طور پر تسلیم کر چکے تھے اور اپنے ہی وطن میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ علامہ اقبال کا یہ کہنا کہ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ' درحقیقت اُن کی دور بینی کا کمال تھا۔

قصہ مختصر' راقم کہنا یہ چاہتا ہے کہ اگرچہ مغرب کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کی وجہ سے اس کی عسکری برتری اب بھی نظر آتی ہے لیکن آج کا مشرق علامہ اقبال کے دور سے کہیں بہتر' ترقی یافتہ اور مغرب کے مقابلے کے لیے کسی حد تک تیار نظر آتا ہے۔ لہٰذا ہماری ایلیٹ کلاس کا یہ کہنا کہ مغرب ماضی میں بھی بالا دستی رکھتا تھا اور آنے والا دور بھی اُسی کا ہے' جزوی طور پر تو درست ہو سکتا ہے لیکن پورا سچ ہرگز نہیں ہے۔

مشرق کی بحیثیت مجموعی مغرب پر برتری کے حوالے سے چند گزارشات پیش ہیں۔ اولاً یہ

بات کہ جو کسی غیر مسلم کے لیے غیر اہم ہو سکتی ہے لیکن راقم کو اس میں ایک مسلمان کی حیثیت سے بڑی روشنی دکھاتی ہے اور مستقبل کے حوالے سے ایک خوش خبری کا درجہ رکھتی ہے وہ یہ کہ قرآن پاک جو حق کے حوالے سے حرفِ آخر ہے‘ متعدد بار مختلف جگہوں پر مشرق اور مغرب کا ذکر کرتا ہے لیکن ہر بار مشرق کو پہلے لاتا ہے اور مغرب کو بعد میں۔ راقم کے نزدیک یہ انتہائی اہم بات ہے اور اصولی طور پر مشرق کی افضلیت کو ظاہر کرتی ہے۔ پھر یہ کہ تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ جمعہ آٹھ دن پہلے برطانیہ اور فرانس جو یورپ کے بڑے ممالک ہیں اُن کے سیاسی‘ معاشی اور معاشرتی حالات کیسے تھے! عالمی سطح پر ان کی کیا حیثیت تھی! مشرقی ممالک کی مسلمان اور غیر مسلم ریاستیں ان تمام شعبہ جات میں کہاں کھڑی تھیں۔ برصغیر پر انگریز کے قبضہ سے پہلے یہ علاقہ دنیا کے امیر ترین ممالک میں شمار ہوتا تھا۔ اسے ’’سونے کی چڑیا‘‘ کہا جاتا تھا۔ اس کا جی ڈی پی حیرت انگیز طور پر باقی دنیا سے بہت زیادہ تھا۔ عوام بھی خوش حال تھے اور حکومتوں کے خزانے بھی بھرے ہوئے تھے۔ مختلف مذاہب کے لوگ گھُل مل کر رہتے تھے‘ جنہیں اپنی عبادات اور رسوم کے حوالے سے پوری آزادی تھی۔ لوگوں کا تعلیمی معیار اعلیٰ تھا۔ یہ چند صدیاں پہلے اس دور کی بات ہے جب مغرب میں لوگ ایک دوسرے کے منہ پر شراب پھینک کر لڑائیاں شروع کر دیتے تھے۔

بہر حال دیانت داری کا تقاضا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ سترہویں صدی کے آغاز ہی سے صورت حال نے زبردست پلٹا کھایا اور مغرب مشرق سے آگے نکلتا دکھائی دیا۔ پھر یورپ میں صنعتی انقلاب نے تو مغرب کو واضح بالادستی دی۔ مشرق ہر گزرتے دن پسپا ہوتا نظر آیا۔ ہمارے یہاں مغرب کے گرویدہ دانشور حضرات درحقیقت تاریخ کو یہاں سے دیکھنا شروع کرتے ہیں‘ جس کی وجہ سے انہیں مغرب ازل ہی سے غالب اور برتر نظر آتا ہے۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی اور اُس کی بنیاد پر عسکری قوت کے حوالے سے نظر ڈالی جائے تو مشرق کے بارے میں منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے: no match۔ واقعتاً مغرب اتنا آگے ہے کہ دوربین سے بھی نظر نہیں آتا۔ مشرقی دنیا پر اس کا محض کنٹرول نہیں بلکہ مکمل قبضہ نظر آتا ہے۔

یہاں حقائق کچھ بدلتے ہیں۔ وہ یوں کہ اگرچہ اس ترقی میں یورپ کے عیسائیوں کی بھی بڑی contribution ہے لیکن باریک بینی سے دیکھیں تو یہودی چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پھر یہ کہ سیاسی طور پر یہودی ایک خاص ایجنڈے کے تحت سرگرم نظر آتے ہیں اور اس ترقی کو اپنا ایجنڈا آگے بڑھانے میں استعمال کر رہے ہیں۔ اُن کا کمال یہ تھا کہ عالمی جنگیں تو یورپ کے دو ملکوں کے درمیان کروائیں لیکن تیا پانچا مشرق خاص طور پر مسلمان حکومتوں کا کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ادارۂ خلافت دم توڑ گیا اور مسلمان ریاستوں کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد وہ برطانیہ جس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا‘ اتنی کمزور ہو گئی کہ اپنے بڑے پن سے خود ہی تائب ہو گئی اور عالمی طاقت کا مرکز لندن سے واشنگٹن منتقل ہو گیا‘ یعنی اس امریکہ میں جہاں یہودی پہلے ہی میڈیا اور تمام وسائل پر قابض ہو چکا تھا۔ یہ بات آن ریکارڈ اور مستند تاریخ کا حصہ ہے کہ یہودی دونوں عالمی جنگوں میں فریقین کو سپورٹ کرتے اور جنگ میں ایندھن ڈالتے رہے۔ راقم عرض یہ کرنا چاہتا ہے کہ اگرچہ مغرب مشرق کو پیچھے دھکیلنے اور برتری حاصل کرنے میں کامیاب تو ہو گیا لیکن اس کی یہ برتری یہودیوں نے کافی حد تک اُچک لی ہے۔ امریکہ سپریم پاور آف دی ورلڈ ہے لیکن کوئی امریکی صدارتی انتخابات کے لیے میدان میں اُتر ہی نہیں سکتا جب تک اسے یہودیوں کے ملک اسرائیل سے این او سی نہ ملے۔ صدر رچرڈ نکسن بہتے آنسو سے روتا ہوا وائٹ ہاؤس سے نکلا تھا‘ اس لیے کہ اس نے ایک ایسا بیان دے دیا تھا جو اسرائیل کے مفادات کے خلاف تھا۔ برطانیہ کے وزیراعظم ٹونی بلیئر نے ہولوکاسٹ کے حوالے سے بے ادبی کا مظاہرہ کیا تھا تو اُسے اسرائیل سے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا پڑی تھی۔

یہاں یہ بات قارئین کے سامنے آنی ضروری ہے کہ دنیا کو اپنی مرضی اور اپنے مفادات کے تحت گھمانے والے صہیونیوں سے ایک بہت بڑا بلنڈر ہوا۔ انہوں نے اپنے بڑے پہلوان امریکہ کو اس صدی کے آغاز میں افغانستان کے میدان میں اتار دیا۔ افغانیوں نے امریکیوں کا بیس اکیس سال میں وہ حشر کیا کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ ہو گیا۔ گویا امریکہ دو دہائیاں افغانستان کی دلدل میں پھنسا رہا۔ اس دوران مشرق نے انتہائی تیزی سے ترقی کی منازل طے کیں۔ جاپان اور جنوبی کوریا جیسی ریاستیں معاشی سطح پر بڑی مضبوط ہو گئیں اور مشرقی دنیا کا ملک چین اقتصادی جِن بن گیا اور ناقابلِ یقین حد تک عسکری سطح پر آگے بڑھ کر امریکہ اور پورے مغرب کو چیلنج کرنے لگا‘ جس سے وہ میزان جو بہت زیادہ مغرب کی طرف جھک چکا تھا

اُس میں توازن پیدا ہوا۔ لہٰذا اب مشرق بڑھتے ہوئے مغرب کے ٹخنوں پر کاٹنے لگا ہے جس سے مغرب غصے اور تکلیف سے بلبلا رہا ہے اور ہر صورت مشرق کے اس ملک یعنی چین کے پر کاٹنا چاہتا ہے اور سرد جنگ کی صورت حال پیدا ہو چکی ہے جو کسی وقت بھی گرم جنگ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ صہیونیوں سے جو بلنڈر ہوا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہ کیا تھا؟ انہوں نے مسلمان ممالک کو تباہ و برباد کرنے کے لیے نائن الیون کا ڈرامہ رچایا۔ اس بنیاد پر امریکہ افغانستان آیا تھا۔ لہٰذا جیسے اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے: ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾﴾ (آل عمران) ''اب انہوں نے بھی چالیں چلیں اور اللہ نے بھی چال چلی۔ اور اللہ تعالیٰ بہترین چال چلنے والا ہے۔'' صہیونیوں کی یہ چال الٹ گئی۔ امریکہ اور اُس کے مغربی اتحادی بیس سال افغانستان میں پھنسے رہے اور مشرقی ملک چین کو اُن کے سامنے آنے کا بڑا اچھا موقع فراہم ہو گیا جس سے اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

اب ہمیں مغرب اور مشرق کی مسابقت اور ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی کوششوں کو گریٹر اسرائیل کے قیام کے پس منظر میں سمجھنا ہوگا۔ اسرائیل اس وقت طاقت کے نشے میں اندھا ہو چکا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی حکومتیں اسرائیل کو اپنا مائی باپ تسلیم کر چکی ہیں۔ یہ جو دو سال سے غزہ میں وحشت اور درندگی کا ننگا ناچ نظر آ رہا ہے' اس کی وجہ یہودیوں خاص طور پر صہیونیوں کی حیوانیت اور جنونیت ہے۔ وہ مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی لاشوں پر گریٹر اسرائیل قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ (خدانخواستہ) مسجد اقصیٰ کو مسمار کر کے تھرڈ ٹیمپل تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ صدر ٹرمپ کا امن منصوبہ درحقیقت آگے بڑھنے سے پہلے دم لینے والی بات ہے۔ اسرائیل کے عوام ہر صورت میں اپنے ان قیدیوں کی رہائی چاہتے تھے جنہیں حماس نے قید کر رکھا تھا۔ اُن کی رہائی کے بغیر اسرائیلی عوام کی بے چینی ختم نہیں ہو سکتی تھی اور اس حوالے سے اسرائیل کی اپوزیشن حکومت پر بڑا جارحانہ رویہ رکھے ہوئے تھی۔ لہٰذا امریکی صدر ٹرمپ کو ساتھ ملا کر صلح کا ڈرامہ رچایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں امریکہ اور یورپ کے عوام جو اسرائیل کے ہاتھوں اہلِ غزہ کے قتلِ عام پر اسرائیل پر تنقید کر رہے تھے' انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش ہے۔ حالات صاف بتا رہے ہیں کہ کچھ ہی عرصہ بعد جو سالوں نہیں چند ماہ پر محیط ہوگا' کوئی نہ کوئی عذر تراش کر فلسطینیوں پر پھر جنگ مسلّط کر دی جائے گی۔ یوں

گریٹر اسرائیل کے لیے اقدامات شروع کر دیے جائیں گے۔ قارئین کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسرائیل کے ہر فوجی کی وردی پر گریٹر اسرائیل کا نقشہ بنا ہوتا ہے۔ لہٰذا اسرائیل دنیا بھر میں خود اور اپنے مغربی غلاموں (امریکہ اور یورپ کے حکمران) کے ذریعے تباہی مچا دے گا لیکن کسی صورت اپنے ایجنڈے سے پسپائی اختیار نہیں کرے گا۔

اس بات کا تصور کرنا کہ اسرائیل اس نام نہاد صلح کے بعد آرام سے بیٹھ جائے گا ایک غلط فہمی نہیں بلکہ حماقت عظمیٰ ہے۔ اسرائیل اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھ ہی نہیں سکتا اگر وہ دوبارہ جنگ نہیں چھیڑتا۔ راقم کی رائے میں ابھی وہ جنگ تو شاید دور ہے جسے حدیث مبارکہ میں ''الملحمۃ العُظمیٰ'' قرار دیا گیا ہے جس کے حوالے سے پہلے امام مہدی اور بعد ازاں نزولِ مسیح کا معاملہ ہے۔ لیکن اسرائیل کے جارحانہ اقدامات سے راقم کی رائے میں تیسری عالمی جنگ ضرور ہو سکتی ہے جس سے دنیا کی آبادی میں بہت بڑی کمی آ جائے گی اور صہیونی یہی چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی تعداد تو دنیا میں اتنی بڑھ نہیں سکتی کہ وہ دنیا کو کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں آ جائیں' البتہ دنیا کو خوفناک جنگوں میں ملوث کر کے کُل دنیا کی آبادی کو اتنا کم کر دیا جائے کہ انہیں دنیا کو کنٹرول کرنے میں دِقت نہ ہو۔ لندن سے قوت کے عالمی مرکز کو واشنگٹن لانے والے چاہتے ہیں کہ قوت کے عالمی مرکز کو واشنگٹن سے اب یروشلم منتقل کیا جائے' جسے وہ آنے والے وقت میں اسرائیل کا دارالحکومت بنانا چاہتے ہیں' جس سے وہ باقی دنیا کو کنٹرول ہی نہیں غلام بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ صہیونیوں کے نزدیک انسان صرف وہ اور یہودی ہیں' باقی سب حیوانات ہیں' لہٰذا ان سے وہ اسی طرح کام لیں جس طرح آج انسان حیوانات سے کام لیتا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ صہیونی تیسری عالمی جنگ اپنی سازشوں سے کروانے کا خواہش مند ہے جس میں مغرب اور مشرق ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے۔ راقم کی رائے میں ایک طرف امریکہ اور یورپ ہوگا تو دوسری طرف چین' روس' ایران اور پاکستان ہوں گے۔ اللہ ہی جانتا ہے اس سب کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ توقع اور امید ہے کہ علامہ اقبال کی دور بینی حقیقت کا رنگ اختیار کرے گی۔ مشرق ماضی کی طرح کامیاب و کامران ہوگا' ان شاء اللہ! ؎

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

❁❁❁

دَورِ فساد میں نجات کی راہ

قیصر جمال فیاضی ☆

دورِ حاضر میں ہر باہوش اور سمجھ دار مسلمان پریشان اور فکرمند ہے۔ اپنے اہل وعیال کو فتنہ گر معاشرے کے اثرات سے بچانا چاہتا ہے مگر ایسا کرنے سے قاصر ہے۔ مسلمان انفرادی طور پر مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ حلال روزی کمانے کے مواقع کم سے کم ہوتے جارہے ہیں۔ اجتماعی تفکّرات علیحدہ سے دامن گیر ہیں۔ غیر اسلامی ممالک میں رہنے والے مسلمان ظلم و ستم کا شکار ہیں۔ وہ ایک طرح سے پنجرے میں قید ہیں۔ مسلم ممالک چاہتے ہوئے بھی ایسے مسلمان بھائیوں کی کسی قسم کی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ مسلمان حکمران ڈرے اور سہمے ہوئے ہیں۔ ان پر خوف طاری ہے کہ اگر ہم نے یورپ، امریکہ اور اسرائیل کے خلاف مسلمانوں کی حمایت میں ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ہماری بادشاہتیں جاتی رہیں گی۔ ہماری عیش وعشرت کی زندگی باقی نہیں رہے گی۔ یہ کم وبیش وہی کیفیت ہے جو نبی اکرم ﷺ نے ایک حدیث مبارکہ میں ارشاد فرمائی۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((يُوْشِكُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْاَكَلَةُ اِلٰى قَصْعَتِهَا)) فَقَالَ قَائِلٌ: وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: ((بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ، وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ، وَلَيَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ، وَلَيَقْذِفَنَّ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ)) فَقَالَ قَائِلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْوَهْنُ ؟ قَالَ: ((حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ)) [سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب فی تداعی الامم علی الاسلام]

☆ معاون، شعبہ تعلیم وتربیت، تنظیم اسلامی

''قریب ہے کہ اقوامِ عالَم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی دعوت دیں گی جیسا کہ کھانا کھانے والے ایک دوسرے کو اپنے دسترخوان کی طرف بلاتے ہیں۔'' اس پر کسی نے کہا: ''کیا اُس روز ہم تعداد میں کم ہوں گے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تعداد میں تو اُس روز تم بہت زیادہ ہو گے، لیکن تمہاری حیثیت جھاگ سے زیادہ نہ ہوگی، جیسا کہ سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکال باہر کرے گا اور خود تمہارے دلوں میں وہن (کی بیماری) ڈال دے گا۔'' کسی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! وہن کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت!''

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا اور کہا: یہ ارشاد فرمانے والے (یعنی نبی اکرم ﷺ) ''الصَّادِقُ الْمَصْدُوق'' ہیں (یعنی آپ ﷺ صادق ہیں اور آپؐ کی تصدیق کی جاتی ہے)۔

اسلام وہ دین ہے جس کی تکمیل کا اعلان اللہ جل شانہ نے اپنے کلام پاک میں فرما دیا ہے۔ اس کے ساتھ واضح الفاظ میں مسلمانوں پر اپنے احسان اور نعمت کے پورا ہونے کا ذکر بھی کیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ:۳)

''آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے اور تم پر اتمام فرما دیا ہے اپنی نعمت کا اور تمہارے لیے مَیں نے پسند کر لیا ہے اسلام کو بحیثیت دین کے۔''

یعنی تمہارے لیے مجھے دینِ اسلام پسند ہے۔ کیا ہی پیارے اور مسرور کر دینے والے الفاظ ہیں! ایسے مکمل دین کے دعوے دار، ایسے کامل دین کے پیروکار اس بات پر پریشان ہوں کہ ہم کیا کریں! اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور اس کے سچے رسول ﷺ نے دین یا دنیا کی کوئی بھی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی ضرورت باقی نہیں چھوڑی جس کے متعلق صاف اور واضح الفاظ میں احکام وہدایات بیان نہ فرما دیے ہوں، ان کے نفع ونقصانات نہ بتا دیے ہوں۔ پھر یہ سب کچھ صرف زبانی تلقین یا کتابی علم نہیں ہے بلکہ اللہ کے سچے رسول ﷺ اور ان کے فریفتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان سب احکامات وہدایات کا عملی تجربہ بھی کر کے دکھا دیا۔ جب مسلمانوں نے نبی اکرم ﷺ کے اتباع کو دقیانوسیت گردانا اور سنتوں پر مر مٹنے کو تنگ نظری سمجھ لیا تو آخرت

میں جو حشر ہوگا سو ہوگا' اس دنیا میں جو حشر ہو رہا ہے وہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

آنچہ بر ماست از ماست خود کردہ را علاجے نیست

''جو مصیبت ہم پر آئی ہے' وہ ہماری اپنی لائی ہوئی ہے' اور اپنی لائی ہوئی مصیبت کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔''

اللہ جل جلالہٗ نے تو بالکل کھلے الفاظ میں سورۃ الشوریٰ میں فرما دیا ہے:

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝٣٠ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝٣١﴾

''اور تم پر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ درحقیقت تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی (اعمال) کے سبب آتی ہے اور (تمہاری خطاؤں میں سے) اکثر کو تو وہ معاف بھی کرتا رہتا ہے۔ اور تم زمین میں (اللہ کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور تمہارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ مددگار۔''

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝٤١﴾ (الروم)

''بحر و بر میں فساد رونما ہو چکا ہے لوگوں کے اپنے کرتوتوں کے سبب تاکہ وہ انہیں مزہ چکھائے ان کے بعض اعمال کا تاکہ وہ لوٹ آئیں۔''

اس قسم کے مضامین قرآن مجید میں دو چار جگہ نہیں بلکہ کئی مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۰ کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں تجھے اس آیت کی تفسیر بتاتا ہوں: ''اے علی! جو کچھ بھی تجھے پہنچے' مرض ہو یا کسی قسم کا عذاب ہو یا دنیا کی کوئی بھی مصیبت' وہ تیرے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے۔''

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ترک کر دینا

احادیث میں حوادث اور آفات کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا گیا ہے' جو اس قدر قوی ہے کہ اس کے زہریلے اثرات میں بسا اوقات وہ بھی لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں جو معاصی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((يَكُوْنُ فِيْ آخِرِ الْاُمَّةِ خَسْفٌ، وَمَسْخٌ، وَقَذْفٌ)) قَالَتْ : قُلْتُ يَا

رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَنَهْلِكُ وَفِيْنَا الصَّالِحُوْنَ؟ قَالَ :((نَعَمْ، اِذَا ظَهَرَ الْخُبْثُ))

[سنن الترمذی ابواب الفتن باب ما جاء فی الخسف]

''اس اُمّت کے آخر زمانے میں خَسف ہوگا (زمین میں آدمیوں اور مکانوں کا دھنس جانا)' اور مَسخ ہوگا (کہ آدمی بندر اور کتے وغیرہ کی صورت ہو جائیں گے)' اور قذف ہوگا (کہ آسمان سے پتھر برسنے لگیں گے)۔ حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ مَیں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم میں نیک لوگ بھی ہوں گے تو کیا پھر بھی ہم ہلاک ہوں گے؟'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں' جب خباثت کی کثرت ہو جائے گی۔''

یہ ارشادگرامی متعدد احادیث میں مختلف عنوانات سے وارد ہوا ہے کہ نیک کاموں کا آپس میں ایک دوسرے کو حکم کرتے رہو اور بری باتوں سے روکتے رہو' ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب مسلط کر دے گا' اور اس وقت اگر دعائیں بھی کی جائیں گی تو قبول نہ ہوں گی۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو ایک مرتبہ کسی بستی کو الٹ دینے کا حکم فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا: پروردگار! ''اس آبادی میں تو تیرا فلاں بندہ ایسا بھی ہے کہ اس نے پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔'' ارشاد ہوا:

((اقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَ عَلَيْهِمْ فَاِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيْ سَاعَةً قَطُّ)) [رواه البيهقی فی شعب الايمان' عن جابر رضی اللہ عنہ]

''الٹو اس بستی کو پہلے اس پر اور پھر دوسروں پر' کیونکہ اس کا چہرہ میری خاطر کبھی متغیّر نہیں ہوا۔''

ان ارشادات کو ذہن نشین کرنے کے بعد آج کل کے معاملات کو شریعت کے پیمانے پر جانچ لیجیے۔ سودی لین دین نہ صرف کھلم کھلا ہو رہا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر سود کو جائز بتایا جاتا ہے' اس کے جواز پر دلائل دیے جاتے ہیں۔ زنا عام ہو گیا ہے اور اس کو کوئی برا فعل نہیں سمجھا جاتا۔ شراب مختلف خوش نما ناموں سے پی جا رہی ہے اور پلائی جا رہی ہے۔ گانا بجانا اور آلاتِ موسیقی عام ہو گئے ہیں۔

اب علماء عظمت کے مینار نہیں رہے بلکہ کھیلنے اور گانے بجانے والوں کی عزت کی جاتی ہے اور انہیں ہیرو گردانا جاتا ہے۔ ٹرانس جینڈر اور LGBT کے نام سے عالمی سطح پر فحاشی کے نئے نئے راستے کھول کر اسے فروغ دیا جا رہا ہے۔

تباہی عام کرنے والے اعمال

کچھ اعمال بھی ایسے ہیں جن کے کرنے پر نبی اکرم ﷺ نے دنیاوی عذاب اور پریشانیوں کا مرتب ہونا ارشاد فرمایا ہے۔ اگر ہم ان پریشانیوں سے بچنا چاہتے ہیں تو چاہیے کہ ان اعمال کو چھوڑ دیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ ایک مرتبہ خاص طور پر متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا:

يَا مَعْشَرَ الْمُهَاجِرِيْنَ، خَمْسٌ اِذَا ابْتُلَيْتُمْ بِهِنَّ، وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ تُدْرِكُوْهُنَّ:(۱) لَمْ تَظْهَرِ الْفَاحِشَةُ فِيْ قَوْمٍ قَطُّ حَتّٰى يُعْلِنُوْا بِهَا اِلَّا فَشَا فِيْهِمُ الطَّاعُوْنُ وَالْأَوْجَاعُ الَّتِيْ لَمْ تَكُنْ مَضَتْ فِيْ اَسْلَافِهِمُ الَّذِيْنَ مَضَوْا (۲) وَلَمْ يَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِلَّا اُخِذُوْا بِالسِّنِيْنَ وَشِدَّةِ الْمَئُوْنَةِ وَجَوْرِ السُّلْطَانِ عَلَيْهِمْ (۳) وَلَمْ يَمْنَعُوْا زَكَاةَ اَمْوَالِهِمْ اِلَّا مُنِعُوا الْقَطْرَ مِنَ السَّمَاءِ، وَلَوْلَا الْبَهَائِمُ لَمْ يُمْطَرُوْا (۴) وَلَمْ يَنْقُضُوْا عَهْدَ اللّٰهِ وَعَهْدَ رَسُوْلِهٖ اِلَّا سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِنْ غَيْرِهِمْ، فَأَخَذُوْا بَعْضَ مَا فِيْ اَيْدِيْهِمْ (۵) وَمَا لَمْ تَحْكُمْ اَئِمَّتُهُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ، وَيَتَخَيَّرُوْا مِمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ بَأْسَهُمْ بَيْنَهُمْ. [سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب العقوبات]

''اے مہاجرین کی جماعت! پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ جب تم ان میں مبتلا ہو جاؤ گے اور میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ تم ان میں مبتلا ہو (تو ان کے عذاب تم پر مسلّط ہو جائیں گے):(۱) جس قوم میں فحاشی (زنا وغیرہ) کھلم کھلا ہونے لگے، اس میں طاعون اور ایسی نئی نئی بیماریاں پھیل جائیں گی جو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔(۲) جو قوم ناپ تول میں کمی کرے گی، وہ قحط، مشقت اور بادشاہ کے ظلم میں مبتلا ہو جائے گی۔(۳) جو لوگ زکوٰۃ روکیں گے، ان سے آسمان سے بارش روک لی جائے گی۔ اگر (بے زبان) جانور نہ ہوتے تو ذرا بھی بارش نہ برسائی جاتی (مگر جانوروں کی ضرورت سے تھوڑی بہت ہوگی)۔(۴) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے عہد کو توڑیں گے، ان پر بیرونی دشمن مسلّط کیے جائیں گے، وہ ان سے چھین لیں گے جو کچھ ان کے پاس ہے۔(۵) جب ان کے حکمران اللہ کی کتاب کے

مطابق فیصلے نہیں کریں گے اور اللہ کے نازل کردہ احکام میں اپنا اختیار استعمال کریں گے تو وہ قوم خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائے گی۔''

ایک حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ چند آدمیوں کے کسی (ناجائز) کام کے کرنے سے عام عذاب تب تک نازل نہیں فرماتے جب تک کہ نہ کرنے والوں کے سامنے وہ کام کیا جائے اور وہ اس کے روکنے پر قادر ہوں اور نہ روکیں۔ اور جب یہ نوبت آجائے تو پھر خاص و عام سب ہی پر عذاب آتا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ (الانفال:۲۵)

''اور اس فتنہ سے ڈرو جو تم میں سے صرف ظالموں ہی کو نہیں پہنچے گا۔''

ہمارے آج کے لیڈر حضرات موجودہ حالات کا ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھہراتے ہیں، الزام تراشی کرتے ہیں۔ نام نہاد دانشور طبقے میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ مسلمان سائنسی تعلیم میں پیچھے رہ گئے ہیں، انہیں جدید تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ دوسرا گروہ یورپ و امریکہ کے مغربی عوام کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ ایک گروہ مسلمانوں کو فلسفیانہ بحثوں میں اُلجھا رہا ہے۔ یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ یہ ہمارا اپنا کیا دھرا ہے۔ ہم نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری سے منہ موڑ لیا ہے، اور یہی اس کا نتیجہ ہے۔

یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے آج کل نئی نئی آفات، زلزلے، طوفان، قحط، سیلاب، آندھیاں، گھر گرنے وغیرہ جیسے حوادث روزمرہ کا معمول بن گئے ہیں۔ نئی نئی بیماریاں، نئے نئے مصائب اور دشمنوں کا غلبہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، جو پہلے کبھی نہ تھا۔ نمازوں کے بعد دعاؤں کے لیے اعلان کر دینا کیسے کافی ہو سکتا ہے جبکہ دعائیں قبول نہ ہونے کے اسباب تو ہم خود اختیار کر رہے ہیں؟

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں سیدھے راستے پر پلٹ آنے اور اس پر استقامت اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

قافلۂ تنظیم: منزل بہ منزل

خورشید انجم ☆

اس مضمون کو تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نئے رفقاء کو معلوم ہو جائے اور پرانے رفقاء کی یاد دہانی ہو جائے کہ تنظیم اسلامی کن کن راہوں سے گزر کر، کن کن مرحلوں کو طے کر کے اور کون کون سے موڑ کاٹ کر آج یہاں تک پہنچی ہے۔ اس کے ساتھ اہم سنگ ہائے میل بھی ہمارے لیے واضح ہو جائیں۔

تعارف: بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو مشرقی پنجاب (جواب ہندوستان میں شامل ہے) کے صوبہ ہریانہ کے ایک قصبے حصار میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں علامہ اقبال کی شاعری سے لگاؤ پیدا ہوا۔ بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کو پڑھ ڈالا۔ ابھی آٹھویں جماعت ہی میں تھے کہ حفیظ جالندھری کا ''شاہنامۂ اسلام'' بھی پورا پڑھ لیا۔ ۴۷-۱۹۴۶ کے عرصے میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک فعال کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔ میٹرک کے زمانہ تعلیم میں عملاً مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔

گورنمنٹ ہائی سکول حصار سے ۱۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کیا۔ ۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان ہجرت کی۔ اس سے قبل حصار میں محصوری کے دوران ''تفہیم القرآن'' سے متعارف ہوئے۔ اس سے قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی رغبت ہوئی۔ اسی عرصے میں اخبار ''الہلال'' کے پرانے پرچے پڑھے، جن سے مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی تعارف حاصل ہوا۔ ایف ایس سی کی تعلیم کے دوران جماعت اسلامی کے ''حلقہ ہمدرداں'' سے منسلک ہو کر بہت جاں فشانی سے کام کیا اور مولانا مودودیؒ کے تمام لٹریچر کا مطالعہ کر لیا۔

☆ مرکزی ناظم تعلیم و تربیت، تنظیم اسلامی

گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف ایس سی کیا۔

۱۹۴۹ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور میں داخل ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن بنے۔ ۱۹۵۱ء میں اسلامی جمعیت طلبہ لاہور کے ناظم بنے۔ ۱۹۵۳ء میں جمعیت کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ جمعیت کی رکنیت کے زمانے ہی میں درس و تدریس شروع کی اور اسی دور میں تحریر و تقریر کی صلاحیت حاصل ہوئی۔ اسی دوران مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف کا بھی مطالعہ کیا اور ان کے دروس سے بھی استفادہ کیا۔ ۱۹۵۴ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد جماعت اسلامی کے رکن بنے۔ رکن بننے کے فوراً بعد ہی محسوس ہوا کہ جماعتِ اسلامی نے اقامتِ دین کے اپنے اصل طریقہ کار سے انحراف کر لیا ہے، لہٰذا ۱۹۵۶ء میں رکن جماعت کی حیثیت سے ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ایک تحریر لکھی اور اپریل ۱۹۵۷ء میں جماعت کی رکنیت سے استعفا دے دیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب ساہیوال میں پریکٹس کر رہے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں اپنا مطب بند کر کے اہل و عیال سمیت کراچی منتقل ہو گئے۔ پھر والد صاحب کی علالت کے باعث ۱۹۵۹ء میں ساہیوال واپس آ گئے۔ ساہیوال آتے ہی حلقۂ مطالعۂ قرآن قائم کیا۔ تقریباً اڑھائی سال ساہیوال میں گزار کر ۱۹۶۲ء میں دوبارہ کراچی گئے اور ۱۹۶۵ء میں واپس آ گئے۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۵ء کو والد صاحب کے انتقال کے بعد لاہور منتقل ہو گئے۔ اس عرصے کے دوران مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے درس دیتے رہے۔ کراچی قیام کے دوران ایم اے (اسلامیات) بھی امتیازی پوزیشن کے ساتھ کر لیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔

تنظیمِ اسلامی: قدم بہ قدم

☆ ''تنظیم اسلامی'' کا نام پہلی بار آج سے ۵۸ سال قبل ۸، ۹ ستمبر ۱۹۶۷ء کو رحیم یار خان میں منعقدہ ایک اجتماع میں سامنے آیا تھا۔ اس اکٹھ میں تقریباً ۱۴۰ ایسے حضرات نے شرکت کی تھی جن کی اکثریت ۵۸-۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئی تھی۔ اواخر ۱۹۶۵ء میں محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے جماعت اسلامی کے حوالہ سے اپنے اختلافی بیان کو ''تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے نتیجے میں جماعت اسلامی سے الگ ہونے والوں میں کسی نئی تشکیل کی خواہش پیدا ہوئی اور آپس میں ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ بالآخر شیخ

سلطان احمد، محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور سردار محمد اجمل خان لغاری نے ایک قرارداد پر دستخط کیے جو جولائی ۱۹۶۷ء کے ''میثاق'' میں ''قرارداد رحیم یار خان'' کے نام سے شائع ہوئی۔ مذکورہ بالا اجتماع کا انعقاد ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی تقریباً ڈیڑھ دو سال کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ تھا۔ اس اجتماع میں ایک سات رکنی مشاورتی کمیٹی بنی۔ البتہ کچھ حوادث کی بنا پر یہ کوشش ناکام ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر یہ طے کرلیا کہ اب جو کچھ بھی کرنا ہے، اپنے بل بوتے پر تنِ تنہا ہی کرنا ہوگا۔

☆ جون ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' کے عنوان سے ایک تحریر لکھی جو اقامتِ دین کے لیے ایک نئی جدّ و جُہد کے حوالے سے ان کی سب سے پہلی تحریر تھی۔ اس تحریر میں ڈاکٹر صاحبؒ نے ''قرآن اکیڈمی'' کے قیام کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ اس کے علاوہ ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' نامی کتاب شائع ہوئی۔

☆ جنوری ۱۹۶۸ء سے سمن آباد، لاہور میں ایک عزیز کے گھر درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ حاضری بڑھ جانے پر مسجد خضراء، سمن آباد میں درس ہونے لگا۔ یہاں ڈاکٹر صاحبؒ نے سب سے پہلے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا درس مکمل کیا۔ اس سے پہلے ساہیوال اور کراچی میں منتخب نصاب کے مکمل درس ہو چکے تھے۔

☆ ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ وہیں پر انہوں نے میڈیکل پریکٹس کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆ مارچ ۱۹۷۱ء میں حج سے واپسی پر دین کے لیے بالکل یکسو ہو کر از سرِ نو کام کا آغاز کیا۔

☆ اگست ۱۹۷۱ء سے کراچی میں دعوتِ قرآنی کا آغاز ہوا۔ لاہور اور کراچی آمد و رفت کے دوران ملتان، رحیم یار خان، صادق آباد اور سکھر میں بھی درسِ قرآن کی نشستیں منعقد ہونے لگیں۔ اس سے قبل مسجد خضراء، سمن آباد لاہور قرآنی تحریک کا ایک مؤثر مرکز بن چکی تھی۔

☆ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے منتخب قرآنی نصاب کے دروس کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اور جس کی بنیاد سورۃ العصر ہے، اس کے تقاضے اسی طرح پورے ہو سکتے تھے کہ اقامتِ دین کی جدّ و جُہد کے لیے ایک ہیئتِ اجتماعیہ وجود میں آجائے۔ یہ دعوت اواخر ۱۹۷۲ء میں انفرادی سعی و جُہد کے دائرے سے نکل کر پہلے مرحلے کے طور پر ایک اجتماعی ادارے ''مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور'' کے تحت منظم ہوئی۔

☆ انجمن کی قرارداد تاسیس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے فرمایا:

''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی کا خواب اُمّتِ مُسلمہ میں تجدید ایمان کی عمومی تحریک کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور اس کے لیے لازم ہے کہ اولاً منبعِ ایمان و یقین یعنی قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کی جائے۔''

☆ مرکزی انجمن خُدّام القرآن کی تشکیل دراصل سمع و طاعت کے ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر مبنی ایک اسلامی جماعت کے قیام و تشکیل کی تمہید تھی۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے پیشِ نظر صرف انجمن بنانا مطلوب نہیں تھا بلکہ اصل مقصد اقامتِ دین کے لیے ایک جماعت قائم کرنا تھا، اور اس کی وضاحت انجمن کے دستور میں بھی کر دی گئی تھی۔

☆ مرکزی انجمن خدام القرآن کے تحت اگست ۱۹۷۲ء میں پہلی دس روزہ قرآنی تربیت گاہ منعقد ہوئی۔ ۱۹۸۹ء تک ہر سال ایک یا دو دس روزہ، پندرہ روزہ، اکیس روزہ اور کبھی کبھار چالیس روزہ تربیت گاہیں مرکزی سطح پر منعقد ہوتی رہیں۔

☆ مرکزی انجمن کے زیر اہتمام ۲۱ روزہ قرآنی تربیت گاہ (یکم جولائی تا ۲۱ جولائی ۱۹۷۴ء منعقدہ مسلم ماڈل ہائی سکول، لاہور) کے اختتامی اجلاس میں تنظیم اسلامی کے قیام کے عزم کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا:

''اب بہت غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد محض اللہ کی تائید و توفیق پر توکّل اور بھروسے پر مَیں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ میری زندگی میں یہ کام صرف درس و تدریس تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ان شاء اللہ احیائے اسلام اور غلبۂ دینِ حق ہی عملاً میری زندگی کا اصل مقصود ہوں گے اور میری بہتر اور بیشتر مساعی بالفعل دعوتِ دین اور خلقِ خدا پر دینِ حق کی جانب سے اتمامِ حُجّت میں صَرف ہوں گی۔ گویا ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) اور اس کی دعوت میں اپنے تمام عزیزوں، دوستوں اور جاننے والوں حتیٰ کہ بزرگوں تک کو دوں گا تاکہ وہ بھی ان مقاصدِ عالیہ کے لیے منظم جدّ و جُہد کر سکیں۔''

☆ اس اعلان کے بعد تقریباً آٹھ ماہ تک لاہور، کراچی، سکھر وغیرہ کے دوروں میں ان قریبی ساتھیوں سے تبادلۂ خیال اور مشورے ہوئے جو دعوتِ رجوع القرآن سے متاثر ہو کر قریب آئے تھے۔ اس عرصے کے دوران ڈاکٹر صاحب حج کے لیے بھی تشریف لے گئے۔ بعد ازاں

۲۷، ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو لاہور میں ایک اجتماع منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تنظیم اسلامی کے اس تاسیسی اجتماع کا پہلا اجلاس جمعرات ۲۷ مارچ کی شام کو بعد نمازِ عصر ۱۲-افغانی روڈ، سمن آباد لاہور میں منعقد ہوا۔ اس میں تنظیم اسلامی کی قرار دادِ تاسیس مع توضیحات اور اس کے دستور کا حصہ اوّل مشتمل ''برنام، شرائطِ شمولیت اور عہد نامہ رفاقت'' بھی منظور کر لیے گئے۔

☆ اسی اجلاس میں ایک سولہ رکنی مشاورتی کمیٹی کا تقرر ہوا جس نے ۲۸ مارچ کی صبح کو ایک اجلاس میں دستور کے حصہ دوم مشتمل بر ''ہیئت تنظیمی'' کی تدوین مکمل کی۔

☆ پہلی نشست میں لاہور، کراچی، سکھر، بہاول پور، ساہیوال، فیصل آباد، شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور واہ سے ۱۰۳ حضرات نے شرکت کی۔ اس تاسیسی اجلاس کا افتتاح محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے کیا اور فرمایا کہ اس اجتماع کی کارروائی مرحلہ وار روبعمل آئے گی۔

(i) پہلے مرحلہ میں اس بات کی وضاحت کی جائے گی کہ از روئے قرآن اقامتِ دین کی جدّوجُہد محض نفلی یا اضافی نیکی نہیں بلکہ فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی کے لیے التزامِ جماعت ضروری ہے۔

(ii) دوسرے مرحلہ میں تنظیم اسلامی کی قرار دادِ تاسیس اور توضیحات منظوری کے لیے پیش کی جائیں گی۔

(iii) تیسرے مرحلہ میں تنظیم اسلامی کے اساسی اعتقادات و نظریات اور تنظیم میں شمولیت کی شرائط کی منظوری کا کام انجام پائے گا۔

☆ اجلاس کی تیسری نشست یعنی تیسرا مرحلہ ۲۸ مارچ کو جمعہ کی نماز کے بعد ہوا۔ اس میں ۷۳ افراد نے شرکت کی۔

☆ ۲۸ مارچ ہی کو مغرب کی نماز کے بعد اس اجلاس کی آخری نشست ہوئی جس میں اس موقع پر موجود حضرات کی شمولیت سے تنظیم اسلامی کا قافلہ ترتیب پایا۔ داعیٔ عمومی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ عہد نامہ رفاقت کی ایک ایک شق پڑھتے رہے اور ۶۲ حضرات اس کو دُہراتے رہے۔

☆ اسی اجلاس میں داعیٔ عمومی نے شیخ جمیل الرحمٰن کو تنظیم کا ناظم عمومی جبکہ قاضی عبد القادر کو مرکزی ناظم بیت المال مقرر کر دیا۔

☆ بعد ازاں جلد ہی کراچی، سکھر، گوجرانوالہ، راول پنڈی اور لاہور سے مزید ساتھی بھی شامل

ہو گئے۔ ۲۲ نومبر ۱۹۷۵ء کو جناب بشیر ملک ناظم عمومی اور جناب قمر سعید قریشی ناظم بیت المال مقرر کیے گئے۔

☆ تنظیم اسلامی کا پہلا سالانہ اجتماع ۲۵، ۲۶ مارچ ۱۹۷۶ء کو لاہور میں منعقد ہوا۔ اس وقت رفقاء کی کُل تعداد ۸۹ تھی، جن میں سے ۶۴ رفقاء نے شرکت کی۔ اس اجتماع میں محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے فرائض دینی کے جامع تصوّر کی وضاحت کی۔ ۸ رفقاء مجلسِ شوریٰ کے رکن مقرر ہوئے۔

☆ دوسرا سالانہ اجتماع مارچ یا اپریل ۱۹۷۷ء میں منعقد ہونا تھا لیکن ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ''پاکستان قومی اتحاد'' (PNA) کی تحریک کے نتیجے میں افراتفری کا عالَم تھا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو مارشل لاء لگ گیا اور یوں حالات معمول پر آ گئے۔ اس کیفیت کو غنیمت جانتے ہوئے ۵ تا ۱۱/اگست ۱۹۷۷ء کو ۷۸-۱۹۷۷ء کا مشترکہ سالانہ اجتماع قرآن اکیڈمی، لاہور میں منعقد کیا گیا۔ اس اجتماع میں رفقاء نے انتخابات کے حوالے سے اپنی آراء کا کھل کر اظہار کیا۔ بعد ازاں انتخابات کے حوالے سے تنظیم کی پالیسی بنائی گئی۔ اسی اجتماع میں یہ معاملہ بھی زیر بحث آیا کہ آئندہ نظام جماعت کیا ہو!

سیر حاصل گفتگو کے بعد طے کیا گیا کہ آئندہ تنظیم اسلامی کا نظام بیعت کے اصول پر مبنی ہوگا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے تنظیم کی امارت سنبھال لی۔ اس اجتماع میں جناب رحمت اللہ بٹر کو ناظم عمومی مقرر کیا گیا۔

☆ چوتھا سالانہ اجتماع ۲۸ تا ۳۰ اپریل ۱۹۷۹ء کو لاہور میں منعقد ہوا۔ بعض وجوہات کی بنا پر دعوت کا کام آگے نہ بڑھنے کی وجہ سے رفقاء کی تعداد ۶۷ رہ گئی تھی۔ ان میں سے بھی ۵۲ رفقاء نے شرکت کی تھی۔ نئے منظور شدہ نظام العمل کی روشنی میں جناب بشیر ملک کو قیم تنظیم مقرر کیا گیا۔ تنظیم کا مکتبہ بھی قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔

☆ پانچواں سالانہ اجتماع ۲۲ تا ۲۴ اپریل ۱۹۸۰ء قرآن اکیڈمی، لاہور میں منعقد ہوا۔ اس میں قاضی عبد القادر کو قیم تنظیم مقرر کیا گیا۔ ہر رفیق تنظیم سے تقاضا کیا گیا کہ وہ ''عہد نامہ رفاقت'' گھر یا دفتر میں کسی نمایاں جگہ آویزاں کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی اس پر نظر پڑ سکے۔ اب تک لاہور میں ۱۲ ایسے حلقہ ہائے دروسِ قرآن وجود میں آ چکے تھے جہاں رفقاء نے منتخب نصاب کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے کراچی تنظیم کو دعوت دی کہ وہ بھی اس

طریق کار کو اپنانے کی طرف متوجہ ہوں۔ اس اجتماع کے موقع پر رفقاء کی کُل تعداد ۱۰۵ تھی اور صرف ۳ تناظیم تھیں: لاہور، کراچی اور سیالکوٹ۔ باقی منفرد رفقاء تھے۔ صرف لاہور تنظیم میں چھ اُسرہ جات قائم تھے۔ جناب الطاف حسین لاہور تنظیم اور جناب عبدالرزاق کراچی تنظیم کے امیر تھے۔ اسی اثناء میں قاضی عبدالقادر کراچی میں ''دعوت وعزیمت'' کے نام سے سائیکلوسٹائل کے ذریعے ایک ماہنامہ بلیٹن کا آغاز کر چکے تھے۔ بعد ازاں یہ سلسلہ جنوری ۱۹۸۰ء میں مارشل لاء کی سختی کی وجہ سے بند کر دیا گیا۔

☆ ٹیلی ویژن پر محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا سب سے پہلا پروگرام ''الکتاب'' کے عنوان سے رمضان ۱۹۷۸ء میں شروع ہوا۔ پورے رمضان المبارک کے دوران روزانہ ایک پارے کا خلاصہ بیان ہوتا رہا۔ اس پروگرام کو بہت مقبولیت ملی۔ پی ٹی وی نے اگلے سال رمضان المبارک میں اسے دوبارہ ٹیلی کاسٹ کیا۔ رمضان ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر صاحب نے ''اَلَمّ'' کے زیرِعنوان ٹیلی ویژن پر پروگرام پیش کیا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء سے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب پر مشتمل ''الہدیٰ'' پروگرام پیش ہوا۔ اس پروگرام کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مقررہ وقت پر پورے گھرانے کے افراد اپنے تمام کام کاج سے فراغت حاصل کر کے ٹیلی ویژن کے آگے بیٹھ جاتے تھے۔ یہ پروگرام نہ صرف ملک بھر میں مقبول ترین دینی پروگرام کی حیثیت اختیار کر گیا بلکہ بھارت میں بھی اسے بہت پزیرائی ملی۔ اس طرح لاکھوں لوگوں تک قرآن کی دعوت پہنچی۔ یہ پروگرام لادینی قوتوں کے احتجاج کے باعث جون ۱۹۸۲ء میں بند ہو گیا جبکہ ابھی نصف منتخب نصاب باقی تھا۔

☆ ستمبر ۱۹۸۴ء سے تاج محل ہوٹل، کراچی کے ایک آڈیٹوریم میں پی ٹی وی کی طرز پر ''شامِ الہدیٰ'' پروگرام شروع کیا گیا، جو حاضری کے اعتبار سے بہت کامیاب رہا۔

☆ کراچی کے پروگرام کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے واپڈا آڈیٹوریم، لاہور میں بھی ''شامِ الہدیٰ'' کا ماہانہ درسِ قرآن شروع کیا گیا، جو بہت کامیاب ہوا۔

☆ چھٹا سالانہ اجتماع یکم تا ۴ مئی ۱۹۸۱ء قرآن اکیڈمی، لاہور میں ہوا۔ اس میں ۱۳۴ رفقاء میں سے ۹۳ رفقاء نے شرکت کی۔ اس اجتماع میں بیعت کے نظام کو برقرار رکھنے کا عزمِ مصمم کیا گیا۔ اگست ۱۹۸۱ء میں حکومت پاکستان نے ڈاکٹر صاحبؒ کو ستارۂ امتیاز سے نوازا۔

☆ ۱۹۸۱ء ہی میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے ڈاکٹر صاحبؒ کو وفاقی وزارت کی پیش کش کی، جسے انہوں نے ٹھکرا دیا۔ بعد ازاں دسمبر ۱۹۸۱ء میں جنرل ضیاء الحق نے وفاقی مجلسِ شوریٰ کی تشکیل کا اعلان کیا اور اس کے لیے ڈاکٹر صاحبؒ کو بھی نامزد فرمایا۔ اس زمانے میں جنرل صاحب کے بعض اقدامات سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اسلام کی بالادستی کے لیے کچھ کام کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا ڈاکٹر صاحبؒ نے مجلسِ شوریٰ میں شمولیت اختیار کر لی تا کہ حکومت کو صحیح مشورے دیے جائیں اور ان کے درست کاموں میں تعاون کیا جائے۔ البتہ صرف دو ماہ بعد ہی ڈاکٹر صاحبؒ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس میں ان کی شمولیت کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ جنرل ضیاء الحق نفاذِ شریعت کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ مزید برآں، اس میں شمولیت کی وجہ سے ان کی دعوتی و تدریسی سرگرمیاں بھی متاثر ہو رہی ہیں۔ لہٰذا ۱۵ مئی ۱۹۸۲ء کو ڈاکٹر صاحبؒ نے مجلسِ شوریٰ سے استعفا دے دیا۔

☆ ساتواں سالانہ اجتماع ۱۹۸۲ء میں منعقد ہوا۔

☆ مارچ ۱۹۸۲ء میں روزنامہ ''جنگ'' کے میگزین میں ڈاکٹر صاحبؒ کا ایک انٹرویو شائع ہوا جس میں انہوں نے پردے کے احکامات کے بارے میں اسلام کی تعلیمات کے مطابق اپنی فکر پیش کی۔ اس پر مارشل لاء قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے صوبہ سندھ کے گورنر کی اہلیہ کی قیادت میں آزاد خیال خواتین نے ڈاکٹر صاحبؒ کے خلاف کراچی ٹی وی سٹیشن پر مظاہرہ کیا، جس کے نتیجے میں ''الہدیٰ'' پروگرام درمیان میں ہی ختم ہو گیا۔

☆ رمضان ۱۹۸۴ء میں قرآن اکیڈمی، لاہور سے نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد ہر سال دورہ ترجمہ قرآن باقاعدگی سے ہوتا رہا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے علاوہ تنظیم کے کئی مزید مدرّسین آگے بڑھے اور انہوں نے بھی دورۂ ترجمۂ قرآن کرانے کی ذمہ داری ادا کرنا شروع کر دی۔ ہر سال یہ تعداد بڑھتی رہی یہاں تک کہ اب پورے ملک میں تقریباً سو سے زائد مقامات پر دورۂ ترجمۂ قرآن اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں خلاصہ مضامین قرآن حکیم کے پروگرام ہوتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کئی اور اداروں اور علماء نے بھی اپنے طور پر دورۂ ترجمۂ قرآن کرانے شروع کر دیے اور اکثر مساجد میں رمضان میں تراویح کے بعد خلاصہ مضامین قرآن حکیم بھی بیان ہونے شروع ہو گئے۔

☆ مئی تا دسمبر ۱۹۸۴ء کے دوران مسجد دار السلام باغِ جناح لاہور میں خطاباتِ جمعہ میں ''منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ'' مکمل بیان ہوا۔

☆ آٹھواں سالانہ اجتماع ۱۹۸۵ء میں منعقد ہوا۔

☆ ۲۳ تا ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء چھ روزہ محاضراتِ قرآنی روزانہ بعد نماز مغرب قرآن اکیڈمی، لاہور میں منعقد ہوئے۔ موضوع تھا: ''قرآن کا تصوّرِ فرائضِ دینی۔'' ان محاضرات کا مقصد یہ تھا کہ علماء وفضلاء کے سامنے ڈاکٹر صاحبؒ اپنا ''فرائضِ دینی کا جامع تصوّر'' رکھیں اور انہیں تنقید کی دعوت دیں۔ اگر انہیں اس تصور میں کوئی غلطی نظر آئے تو اس کی نشان دہی کریں، بصورت دیگر تائید کریں۔ تقریباً ۱۰۰ علماء کرام کو دعوت دی گئی تھی۔ جن حضرات نے بالفعل شرکت کی، ان کی تعداد ۲۱ تھی۔ مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل، مولانا محی الدین لکھوی، مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری، مولانا اخلاق حسین قاسمی اور دیگر مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے جید علماء کی واضح اکثریت نے ڈاکٹر صاحبؒ کے فکر کی کُلّی یا جُزوی تائید کی۔

☆ ۱۱ دسمبر تا ۲۰ دسمبر ۱۹۸۵ء ڈاکٹر صاحبؒ نے ابوظبی میں ''قرآن کی عظمت اور اس کی تعلیمات'' پر مشتمل دس روزہ پروگرام کیا۔ اس کو بہت پزیرائی حاصل ہوئی۔ ایک وسیع حلقے تک تنظیم کی دعوت پہنچی اور ایک بہت بڑی تعداد نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی۔

☆ ۱۹۸۶ء میں تنظیم اسلامی نے متحدہ شریعت محاذ میں شمولیت اختیار کی۔ البتہ جلد ہی یہ محسوس ہوا کہ محاذ میں شامل جماعتیں نفاذِ شریعت کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہیں یا پھر نفاذِ شریعت ان کی پہلی ترجیح نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے علیحدگی اختیار کر لی گئی۔

☆ ۱۹۸۶ء ہی میں اکیس روزہ تربیت گاہ میں منتخب نصاب نمبر ۲ (حزب اللہ کے اوصاف) کی تدریس مکمل ہوئی۔

☆ ۱۹۸۶ء میں تمام رفقاء تنظیم کو تحریری صورت میں تجدید بیعت کی دعوت دی گئی تاکہ جو بھی تنظیم میں شامل رہنا چاہے وہ شعوری طور پر علیٰ وجہ البصیرہ ایسا کرے۔

☆ ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر صاحبؒ کی تالیف ''جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی'' شائع ہوئی۔

☆ ۱۹۸۸ء میں سالانہ اجتماع طارق آباد، ضلع بہاول نگر میں منعقد ہوا۔

☆ مرکزی مجلسِ مشاورت منعقدہ ۲، ۳ مارچ ۱۹۸۸ء میں طے کیا گیا کہ قراردادِ تاسیس مع

توضیحات اور شرائط شمولیت پر مشتمل مفصل تحریر کو آئندہ تنظیم کی آئینی و دستوری اساس نہیں بلکہ اس کے دعوتی و تربیتی لٹریچر کا اہم اور بنیادی حصہ سمجھا جائے گا۔ علاوہ ازیں، تنظیم کو انقلابی خطوط پر چلایا جائے گا۔ ضروری مشاورت کے بعد رفقاء کے تین درجات متعین کیے گئے: مبتدی، منتظم اور غیر فعال۔ بعد ازاں ''منتظم'' کے بجائے ''ملتزم'' کی اصطلاح اختیار کر لی گئی۔

☆ ۱۹۸۹ء سے پہلے ہر سال ایک یا دو مرکزی تربیت گاہیں منعقد ہوتی تھیں۔ ان کا دورانیہ کبھی ۱۰ روزہ، کبھی ۱۵ روزہ، کبھی ۲۱ روزہ اور کبھی ۴۰ روزہ ہوتا تھا۔ ۱۹۸۹ء میں سالانہ اجتماع کے موقع پر رفقاء کے لیے باقاعدہ مبتدی اور ملتزم تربیت گاہیں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ پہلی مبتدی تربیت گاہ ۲ تا ۹ جون ۱۹۸۹ء اور پہلی ملتزم تربیت گاہ ۱۶ تا ۲۳ جون ۱۹۸۹ء قرآن اکیڈمی، لاہور میں منعقد ہوئیں۔

☆ ۱۹۸۹ء میں حلقہ جاتی تقسیم کا اعلان کیا گیا۔ کل سات حلقہ جات کراچی، بلوچستان، جنوبی پنجاب، لاہور، شمالی پنجاب، سرحد اور وسطی پاکستان بنائے گئے۔

☆ ۱۹۹۰ء میں بیعت کے تقاضوں کے مطابق نظام العمل مرتب کیا گیا۔

☆ اواخر ۱۹۹۱ء میں تحریک خلافت پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ پہلا جلسۂ خلافت دھوبی گھاٹ، فیصل آباد میں ہوا۔

☆ ۲ تا ۱۳ اپریل ۱۹۹۵ء ملتزم رفقاء کا ایک مشاورتی اجتماع قرآن اکیڈمی، لاہور میں منعقد ہوا۔ یہ اجتماع درج ذیل امور کے بارے میں مشورہ کے لیے تھا:

(i) آئندہ تنظیم کا نظم دستوری ہو یا بیعت سمع وطاعت پر مبنی ہو؟ اکثریت کی آراء نظامِ بیعت کے حق میں آئیں۔

(ii) ڈاکٹر صاحبؒ کو جانشین نامزد کرنا چاہیے یا اس کا فیصلہ مرکزی مجلسِ شوریٰ پر چھوڑ دیا جائے؟ نامزد کرنے کی صورت میں اس کا اعلان کر دیا جائے یا وصیت کی شکل میں محفوظ رکھا جائے؟ اکثریت کی رائے تھی کہ ڈاکٹر صاحبؒ کو اپنی زندگی ہی میں اپنے جانشین کا اعلان کر دینا چاہیے۔

☆ ۲۰، ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو سالانہ اجتماع مینارِ پاکستان سے ملحقہ وسیع میدان میں منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر ''پہلی عالمی احیاءِ خلافت کانفرنس'' کا بھی انعقاد کیا گیا۔

☆ ۱۹۹۶ء میں سالانہ اجتماع لیاقت باغ‘ راول پنڈی میں منعقد ہوا۔

☆ اپریل ۱۹۹۶ء میں ملتزم رفقاء کا دوسرا مشاورتی اجتماع برائے جانشین (آئندہ امیر) منعقد ہوا‘ جس میں رفقاء کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔

☆ ۱۴ فروری ۱۹۹۷ء کو مسجد دارالسلام‘ باغ جناح‘ لاہور میں خطابِ جمعہ میں بانی محترمؒ نے ’’مسلم لیگ: احیاء کے تقاضے اور نواز شریف کو مخلصانہ مشورے‘‘ کے حوالے سے گفتگو کی۔ بعدازاں ۱۸ فروری ۱۹۹۷ء کو اس گفتگو کی کیسٹ مع ایک خط نواز شریف کے والد محترم جناب میاں محمد شریف کی خدمت میں اس استدعا کے ساتھ ارسال کی کہ وقت نکال کر اس کی سماعت فرمائیں اور اگر مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہو تو مجھے طلب فرمائیں یا آپ تشریف لانے کی زحمت گوارا کر لیں۔ اس کے جواب میں ۲۳ فروری ۱۹۹۷ء بروز اتوار میاں محمد شریف صاحب مع اپنے تینوں بیٹوں میاں نواز شریف‘ میاں شہباز شریف اور میاں عباس شریف‘ قرآن اکیڈمی تشریف لائے۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحبؒ نے میاں نواز شریف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حالیہ انتخابات میں مسلم لیگ کو دو تہائی اکثریت سے شاندار کامیابی عطا فرمائی ہے۔ یہ سنہری موقع ہے کہ آپ آئین میں وہ تمام ضروری ترامیم کرا سکتے ہیں جن کا وعدہ آپ نے سابقہ دورِ حکومت میں کیا تھا۔ میاں شہباز شریف نے استفسار کیا کہ ہم بھی خلافت راشدہ کا نظام لانا چاہتے ہیں‘ اس کے لیے ہمیں عملی طور پر کیا کرنا ہوگا! ڈاکٹر صاحبؒ نے فرمایا کہ آئین میں یہ واحد ترمیم کر دیں کہ ’’ہر سطح پر قرآن وسُنّت کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی ہوگی۔‘‘ اس کے ساتھ آئین میں موجود ان تمام دفعات کو ختم کر دیا جائے جو قراردادِ مقاصد سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ مزید برآں‘ شرعی عدالت کا درجہ کم از کم ہائی کورٹ کے برابر کر دیا جائے اور اس پر سے وہ تمام پابندیاں ختم کر دی جائیں جو صدر جنرل ضیاء الحق نے عائد کی تھیں۔ سود کے خاتمے کے بارے میں بھی گفتگو ہوئی۔

☆ ۱۵ مارچ ۱۹۹۷ء کو ’’مطالبہ تکمیل دستورِ خلافت‘‘ مہم کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔ اس مہم میں خاص طور پر رفقاء کی طرف سے بڑی تعداد میں پوسٹ کارڈ‘ خطوط اور ٹیلی گرام وزیر اعظم سیکریٹریٹ‘ اسلام آباد ارسال کیے گئے۔

☆ اپریل ۱۹۹۷ء میں ملتزم رفقاء کا تیسرا مشاورتی اجتماع منعقد ہوا۔ رفقاء کی اکثریت نے

رائے دی کہ ڈاکٹر صاحبؒ جانشین کے نام کا اعلان کر کے اپنے ساتھ کام کرنے کا موقع فراہم کریں تاکہ نئے امیر کی تربیت بھی ہو جائے۔

☆ ۲۶ اکتوبر تا یکم نومبر ۱۹۹۷ء ملتزم رفقاء کا چوتھا مشاورتی اجتماع منعقد ہوا۔ آئندہ امیر کے لیے رائے لی گئی۔ کل چھ نام آئے: چودھری رحمت اللہ بٹر‘ ڈاکٹر عبدالخالق‘ ڈاکٹر عبدالسمیع‘ جناب عبدالرزاق‘ حافظ عاکف سعید اور جناب مختار حسین فاروقی۔ مرتب شدہ سوال نامہ کی روشنی میں ان حضرات نے رفقاء کے سامنے اپنا تعارف رکھا۔ دسمبر ۱۹۹۸ء میں منعقدہ مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں تمام تجاویز پر غور کیا گیا۔ رمضان ۱۴۱۸ھ کے آخری عشرہ میں ڈاکٹر صاحبؒ نے اس معاملے پر استخارہ کیا۔

☆ ۴ سالہ مشاورت کے بعد ۱۴ فروری ۱۹۹۸ء کو ملتزم رفقاء کے ایک خصوصی اجتماع میں حافظ عاکف سعید کی جانشینی کا اعلان کیا گیا۔

☆ ۱۹۹۸ء میں تنظیم اسلامی‘ تحریک اسلامی‘ الاخوان‘ جمعیت اہلِ حدیث (لکھوی گروپ) پر مشتمل ’’متحدہ انقلابی محاذ‘‘ کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کو اس محاذ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

☆ ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے قرآن اکیڈمی‘ ڈیفنس‘ کراچی میں دورۂ ترجمہ قرآن کیا‘ جس کی ویڈیو ریکارڈنگ جدید ڈیجیٹل کیمروں کے ذریعہ کی گئی۔ یہ ریکارڈنگ QTV اور کئی دیگر چینلز پر نشر ہوئی اور ۱۲۶ ممالک میں لاکھوں لوگوں تک قرآن کا پیغام پہنچا۔ بعدازاں‘ اسے کیسٹس سے اُتار کر قرآن اکیڈمی لاہور کے شعبہ مطبوعات نے تسوید وتبییض اور ترتیب وتدوین کے جملہ مراحل طے کر کے ’’بیان القرآن‘‘ کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا۔

☆ فرقہ واریت میں شدّت پسندی اور بڑھتی ہوئی دہشت گردی کے خاتمے کی خاطر مناسب قوانین کا مسودہ تیار کرنے کی غرض سے حکومت کی جانب سے علماء کمیٹی بنائی گئی اور ڈاکٹر صاحبؒ کو اس کی سربراہی سونپی گئی۔ بعدازاں بعض حلقوں کی جانب سے ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی ذات پر اعتراض کی بنیاد پر اس کمیٹی کی سربراہی سے استعفادے دیا۔

☆ ۱۵ تا ۱۷ ستمبر ۲۰۰۲ء مرکزی مجلسِ مشاورت کے اجلاس میں ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی علالت کی بنا پر امارت حافظ عاکف سعید صاحب کو سونپ دی اور نئے امیر کے ہاتھ پر

بیعت کر کے خود سبک دوش ہو گئے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر صاحبؒ نے رفقاء کو درج ذیل محکم اساساتِ اربعہ کو مضبوطی سے تھامنے کی وصیت کی:

(i) دعوت بذریعہ قرآن

(ii) نظامِ بیعت

(iii) انفرادی طور پر ہر رفیق کا اصل نصب العین رضائے الٰہی کا حصول اور اُخروی نجات کی غرض سے دین کے قیام کی جِدّ و جُہد ہے۔

(iv) منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

☆ ۲۷ دسمبر ۲۰۰۲ء کو امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید نے جناب اظہر بختیار خلجی کو ناظم اعلیٰ مقرر فرمایا جبکہ سابق ناظم اعلیٰ ڈاکٹر عبدالخالق کو ناظم نشر و اشاعت مقرر فرمایا۔

☆ مرکزی مجلسِ شوریٰ ۲۰۰۳ء کے موقع پر تنظیم میں ''اعانت'' کی بجائے ''انفاق فی سبیل اللہ'' کی اصطلاح استعمال کرنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ آئندہ انفاق کے ضمن میں باز پُرس اور محاسبہ نہیں ہوگا' البتہ ترغیب وتشویق کا اہتمام کیا جائے گا۔

☆ ۲۵ تا ۲۷ دسمبر ۲۰۰۳ء کل پاکستان ملتزم رفقاء کا تربیتی اجتماع کراچی میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر انفرادی دعوت کا نظام متعارف کروایا گیا۔

☆ ۲۰۰۵ء میں پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں شدید زلزلہ آیا۔ اس کی وجہ سے سالانہ اجتماع کو منسوخ کر دیا گیا اور اس کے لیے مختص کردہ فنڈز زلزلہ زدگان کی امداد اور تعمیرِ نو کے لیے خرچ کیے گئے۔

☆ ۲۰۰۵ء میں امیر تنظیم اسلامی نے بھرپور مشاورت کے بعد فیصلہ کیا کہ تنظیم اسلامی میں آئندہ سے زکوٰۃ کو ''فی سبیل اللہ'' کی مد میں خرچ نہیں کیا جائے گا۔ چونکہ زکوٰۃ اصلاً فقراء و مساکین کا حق ہے اور ''فی سبیل اللہ'' میں توسّع کے معاملہ میں علماء کا اختلاف پایا جاتا ہے' لہٰذا زکوٰۃ جیسے معاملہ میں محتاط طرزِ عمل زیادہ بہتر ہوگا۔

☆ ۲۰۰۴ء اور ۲۰۰۶ء کے سالانہ اجتماعات دراجکے' سادھوکے میں منعقد ہوئے۔

☆ ۲۰۰۶ء میں نئے شامل ہونے والے رفقاء کو پہلے مرحلہ کے طور پر تنظیم کی فکر سے روشناس کرانے کے لیے حلقہ کی سطح پر ایک تعارفی پروگرام ترتیب دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نئے شامل

ہونے والے رفقاء اکثر اوقات فوری طور پر مبتدی تربیتی کورس میں شمولیت اختیار نہیں کر پاتے۔

☆ ۲۰۰۸ء میں تنظیم اسلامی میں شادی شدہ رفقاء کے لیے گھریلو اُسرہ منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ حلقہ جات کی زونز میں تقسیم اور نائبین ناظم اعلیٰ کی تقرری عمل میں آئی۔

☆ ۲۰۰۹ء میں سالانہ اجتماع مرکزی اجتماع گاہ بہاول پور میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تیاریاں مکمل کر لی گئی تھیں لیکن اس وقت کے پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب شہباز شریف نے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو عین وقت پر فون کر کے اجتماع منسوخ کرنے کی سفارش کی۔ لہٰذا اجتماع منسوخ کر دیا گیا۔

☆ ۴ تا ۹ مارچ ۲۰۱۰ء پہلی مرتبہ آل پاکستان اُمراء مقامی تناظیم کے لیے ایک خصوصی تربیتی کورس فیصل آباد میں منعقد ہوا۔

☆ ۱۴ اپریل ۲۰۱۰ء کو ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کے مرقد پر رحمتوں کا نزول فرمائے!

☆ ۲۲ تا ۲۹ اکتوبر ۲۰۱۰ء ''توبہ کی پکار'' کے عنوان سے ایک ملک گیر مہم چلائی گئی۔

☆ مدرّسین کے لیے سالانہ ریفریشر کورسز منعقد کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔

☆ کُل پاکستان اُمراءِ تناظیم کے لیے دوسرا خصوصی تربیتی اجتماع ۲۴ تا ۲۷ مارچ ۲۰۱۲ء فیصل آباد میں منعقد ہوا۔

☆ فحاشی اور عریانی کے خلاف ملک گیر دستخطی مہم شروع کی گئی' جو ۳ نومبر ۲۰۱۳ء تا ۵ جنوری ۲۰۱۴ء جاری رہی۔ ان دستخطی شیٹوں کو صوبہ جاتی بنیادوں پر جلد کروایا گیا اور ان کی سی ڈی بنا کر وزیر اعظم پاکستان کو ارسال کی گئی۔

☆ اُمراءِ مقامی تناظیم کے لیے تیسرا خصوصی تربیتی کورس ۲۲ تا ۲۵ نومبر ۲۰۱۴ء فیصل آباد میں منعقد ہوا۔

☆ ۲۰۱۵ء میں ملک گیر انسدادِ سود مہم ۹ نومبر تا ۲۵ دسمبر جاری رہی۔ یہ مہم بہت کامیاب رہی۔ پورے ملک میں تنظیم اسلامی کا تعارف ہوا۔

اس مہم کے دوران اخبارات میں سود کے خلاف کالم لکھے گئے۔ جماعت اسلامی اور کئی دوسری جماعتوں کی بھرپور تائید حاصل ہوئی۔ متعدد علماء نے خطاباتِ جمعہ میں سود کے خلاف

آواز اٹھائی۔ اس طرح پورے ملک میں سود کے خلاف ایک فضا بن گئی۔ تنظیم اسلامی کی سود کے خلاف کوششوں کا آغاز ۲۰۱۲ء سے ہوا تھا۔ ۲۰۱۳ء میں امیر تنظیم اسلامی کی جانب سے سپریم کورٹ میں سود کو ختم کرنے کے لیے درخواست دائر کی گئی۔ ۲۰۱۵ء میں سپریم کورٹ کے جج جسٹس سرمد جلال عثمانی نے یہ کہہ کر درخواست خارج کر دی کہ ''جو سود نہیں لینا چاہتے وہ نہ لیں اور جو سود لے رہے ہیں ان کو اللہ خود پوچھ لے گا۔'' ۲۰۰۲ء سے سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بینچ کی جانب سے انسدادِ سود کا ایک نہایت اہم مقدمہ فیڈرل شریعت کورٹ کے پاس معرضِ التوا میں پڑا تھا۔ تنظیم اسلامی کی کوششوں سے اسے ۲۰۱۵ء میں سماعت کے لیے منظور کیا گیا۔ سپریم کورٹ نے چودہ سوالات پر مشتمل ایک سوال نامہ جاری کیا' جن کے جوابات انجمن خدام القرآن لاہور کے شعبہ تحقیق کی طرف سے دیے گئے۔

☆ ۲۰۱۶ء میں ایک ماہ پر مشتمل قرآنی تربیت گاہ برائے مدرسین کراچی میں منعقد ہوئی۔

☆ ۲۰۱۹ء میں امراءِ مقامی تناظیم کے لیے چوتھا خصوصی تربیتی کورس ۲۱ تا ۲۴ مارچ فیصل آباد میں منعقد ہوا۔

☆ ۲۰۱۹ء ہی میں ملک گیر ''دعوتِ فکرِ اسلامی'' مہم یکم اگست تا ۱۳ اکتوبر منعقد کی گئی۔

☆ امیر تنظیم اسلامی نے مشاورت کے بعد ۱۲ دسمبر ۲۰۱۹ء کو جناب اعجاز لطیف کو نائب امیر تنظیم اسلامی مقرر کیا۔

☆ یکم تا ۷ مارچ ۲۰۲۰ء ''حیامہم'' کا اہتمام کیا گیا۔

☆ ۱۴ جولائی ۲۰۲۰ء کو امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید نے اپنی علالت کے باعث مرکزی مجلس عاملہ کے نام ایک تحریر میں امارت سے دست برداری کا اظہار کیا اور ہدایت کی کہ نئے امیر کے تقرر کے حوالے سے جلد از جلد مرکزی شوریٰ کا اجلاس بلایا جائے۔ مرکزی عاملہ کے خصوصی اجلاس منعقدہ ۱۶ جولائی ۲۰۲۰ء میں اس حوالے سے تفصیلی گفتگو اور مشاورت کے بعد غالب اکثریت نے اس بات سے اتفاق کیا کہ امیر محترم کی علالت اور تنظیم کی بہتری کے پیشِ نظر امارت کی تبدیلی ضروری ہے۔ نئے امیر کے تقرر کے لیے مجلس شوریٰ کا اجلاس ۸' ۹ اگست ۲۰۲۰ء کو منعقد کرنے اور ڈاکٹر غلام مرتضیٰ کو ناظم استصواب رائے مقرر کرنے کی تجویز دی گئی' جسے امیر تنظیم نے منظور فرمایا۔

مرکزی مجلسِ شوریٰ کے کُل ۱۸۸ ارکان میں سے ۸۲ نے شرکت کی۔ واضح اکثریت نے جناب شجاع الدین شیخ کے حق میں رائے دی۔ امیر محترم حافظ عاکف سعید نے نئے امیر جناب شجاع الدین شیخ کے تقرر کا باقاعدہ اعلان فرمایا۔ امارت کی اس منتقلی کے موقع پر سابق امیر محترم نے اپنی الوداعی تقریر میں ان ۶ اساسی محکمات کا خاص طور پر ذکر کیا جو ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ۲۰۰۸ء کے سالانہ اجتماع کے موقع پر رفقاءِ تنظیم کے نام اپنے پیغام میں بیان کیے تھے:

(i) ہمارا نصب العین صرف اور صرف اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح کا حصول ہے۔

(ii) ہماری اجتماعی جِدّ و جُہد کا ہدف اور مقصود اللہ کے دین کو بتمام و کمال ایک مکمل نظامِ اجتماعی شکل میں نافذ کرنا ہے اور یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک انقلابی ہدف ہے۔

(iii) ہماری دعوت کا مرکز و محور قرآن ہے۔

(iv) ہمارا طریق تربیت و تزکیہ بھی ''خانقاہی'' نہیں بلکہ انقلابی یعنی نبوی طریقِ تزکیہ پر مبنی ہے۔

(v) ہماری تنظیم کی اساس ''بیعت سمع و طاعت فی المعروف'' پر قائم ہے۔

(vi) ہمارا منہج سیرتِ نبوی ﷺ سے ماخوذ ہے۔

بعد ازاں' سوائے ایک رکن شوریٰ تمام موجود اراکین شوریٰ بشمول سابقہ امیر حافظ عاکف سعید نے نئے امیر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ آخر میں نئے امیر (جناب شجاع الدین شیخ) نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا و نبی کریم خاتم النبیین ﷺ پر درود و سلام اور دعا کے بعد ایک حدیث مبارکہ کے حوالے سے کہا کہ امارت بغیر مانگے مل جائے تو اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوتی ہے' اور اگر کوئی خود سے مانگے تو پھر وہ اسی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنا ذاتی تعارف اور موجودہ ذمہ داریوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ مجھے آپ حضرات کی تائید و نصرت اور دعاؤں کی شدید ضرورت ہوگی۔ اس خطہ میں چار سو سالہ دینی جِدّ و جُہد اور امانت کا بار ہمارے ذمہ ہے۔ آپ امیر تنظیم کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ سے آسانی اور عافیت کی دعا مانگتے رہنا چاہیے۔

☆ ۲۰۱۹ء تا ۲۰۲۱ء لاہور' فیصل آباد' اسلام آباد اور کراچی میں ایک ایک ہفتے پر مبنی فکری و عملی رہنمائی کورس اور تین روزہ ''حزب اللہ کے اوصاف'' کورس منعقد ہوئے۔

☆ ۲۰۲۰ء میں تزکیۂ نفس کے لیے درج ذیل چار بنیادی حصوں پر مشتمل ایک جامع پروگرام

''احسان اسلام'' ترتیب دیا گیا:

(ا) پابندیٔ شریعت

(ب) اخلاقیات وآداب

(ج) انفرادی واجتماعی دعوت

(د) اقامتِ دین

☆ ۲۱ تا ۲۳ مارچ ۲۰۲۱ء فاضلین درسِ نظامی کا ایک خصوصی اجتماع منعقد ہوا۔

☆ ۲۰۲۲ء میں سیلاب کی وجہ سے سالانہ اجتماع منعقد نہ ہوسکا۔ اس کی بجائے ۱۹ تا ۲۰ نومبر پانچوں زونز میں زونل اجتماعات منعقد ہوئے۔ کراچی زون میں دو اجتماعات منعقد ہوئے تھے جبکہ باقی زونل اجتماعات اسلام آباد، لاہور، فیصل آباد اور مردان میں منعقد ہوئے۔

☆ ۵ تا ۸ فروری ۲۰۲۳ء آل پاکستان اُمراء اجتماع منعقد ہوا۔

☆ تربیتی نصاب برائے مبتدی رفقاء میں درج ذیل کتب کا اضافہ کیا گیا:

(ا) اعتصام باللہ (شعبہ تعلیم وتربیت)

(ب) شمائلِ نبوی ﷺ (شعبہ تعلیم وتربیت)

(ج) تعمیرِ سیرت کی اساسات اور قرآن کا انسانِ مطلوب (منتخب نصاب ا، درس ۱۰) (ڈاکٹر اسرار احمدؒ)

(د) اللہ کے محبوب بندوں کی شخصیت کے خدوخال (منتخب نصاب ا، درس ۱۱) (ڈاکٹر اسرار احمدؒ)

☆ تربیتی نصاب برائے ملتزم رفقاء میں درج ذیل کتب کا اضافہ کیا گیا:

(ا) احسانِ اسلام (تزکیۂ نفس) (شعبہ تعلیم وتربیت)

(ب) قربِ الٰہی کے آسان طریقے (خرم مراد)

(ج) ترکِ رذائل اور اکتسابِ فضائل (شعبہ تعلیم وتربیت)

☆ تربیتی نصاب برائے ذمہ داران میں درج ذیل کتب کا اضافہ کیا گیا:

(ا) اسلام کا اخلاقی وروحانی نظام (ڈاکٹر اسرار احمدؒ)

(ب) نبی اکرم ﷺ کا اساسی منہج (سورۃ الجمعہ، آیت ۲) (ڈاکٹر اسرار احمدؒ)

(ج) تعبیر کی کوتاہی (''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ'' از ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا ایک باب)

(د) تحریک اور کارکن (سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

☆ مدرسین کے تربیتی نصاب میں درج ذیل کتب کا اضافہ کیا گیا:

(ا) منہاج القاصدین (ابنِ جوزی)

(ب) تزکیۂ نفس (امین احسن اصلاحی)

☆ بنیادی دینی تربیتی نصاب مندرجہ ذیل کتب پر مشتمل ترتیب دیا گیا:

(ا) آدابِ زندگی (مولانا محمد یوسف اصلاحی)

(ب) آسان فقہ (مولانا محمد یوسف اصلاحی)

(ج) بلوغ المرام (ابن حجر العسقلانی)

☆ اسی سال شعبہ تعلیم وتربیت نے ''بے حیائی اور فحاشی کی روک تھام کے لیے عملی اقدامات'' نامی کتابچہ شائع کیا۔

☆ فلسطین کی صورتِ حال کے حوالہ سے درج ذیل خصوصی مہمات کا انعقاد کیا گیا:

(ا) ''اہلِ غزہ اور فلسطین کی صورتِ حال'' کے حوالہ سے ۲۱ روزہ خصوصی مہم کا اہتمام کیا گیا۔ اس مہم کے دوران حکومتی اداروں اور سیاسی زعماء کو خطوط لکھے گئے۔

(ب) ''اہلِ غزہ کی پکار اور ہمارا کردار'' کے نام سے ۲۳ تا ۲۵ مارچ ۲۰۲۴ء مہم چلائی گئی۔

(ج) ۱۵ تا ۲۵ دسمبر ۲۰۲۳ء ''حرمتِ مسجدِ اقصیٰ اور ہماری ذمہ داریاں'' مہم کا اہتمام کیا گیا۔

(د) ۲۶ اکتوبر ۲۰۲۳ء کو ''فلسطین کی موجودہ صورتِ حال میں مسلمانوں کے کرنے کا کام'' مہم کا انعقاد کیا گیا۔

(ہ) ۳۰ مارچ ۲۰۲۴ء کو ''حرمتِ مسجدِ اقصیٰ، غزہ میں مظالم اور ہماری ذمہ داریاں'' کے عنوان سے مہم چلائی گئی۔

(ز) ۴ ستمبر ۲۰۲۵ء کو ''اسرائیل نواز ممالک کی مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ'' مہم کا آغاز کیا گیا۔

☆ ۲۶ فروری تا ۷ مارچ ۲۰۲۳ء ''حیا اور ایمان'' مہم چلائی گئی۔

☆ ۱۱ تا ۳۱ اگست دو ہفتوں پر مبنی ''بقائے پاکستان: نفاذِ عدلِ اسلام'' مہم کا اہتمام کیا گیا۔

☆ ۲۸ اپریل تا یکم مئی ۲۰۲۵ء آل پاکستان اُمراء خصوصی اجتماع مرکز دارالاسلام، چوہنگ میں منعقد ہوا۔

☆ ہر سال امیر محترم کے ہر حلقہ میں تنظیمی اور دعوتی دورے معمول کے مطابق جاری رہے۔

☆ امیر محترم باقاعدگی کے ساتھ کراچی اور لاہور میں اجتماع جمعہ سے خطاب کرتے رہے۔

(امیر محترم ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا جمعہ لاہور جبکہ دوسرا اور چوتھا جمعہ کراچی میں پڑھاتے ہیں۔)

تنظیم اسلامی کے پچاس سال

قافلۂ تنظیم منزل بہ منزل‘ خاص توفیق و تائید اور نصرتِ الٰہی سے اپنے تیسرے امیر کی قیادت میں‘ پچاس سالہ زندگی کو مکمل کرتے ہوئے اپنے اکیاون (۵۱) ویں سال میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ قافلہ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے‘ گو کہ رفتار دھیمی ہے۔ راستے میں بہت سے اُتار چڑھاؤ آئے ہیں‘ لیکن اس بات پر اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ وہ قافلہ جو مارچ ۱۹۷۵ء میں باسٹھ (۶۲) افراد پر مشتمل ترتیب پایا تھا‘ اور جس نے ۱۹۷۷ء میں بیعت کا نظام اختیار کیا تھا‘ آج ماہِ اکتوبر ۲۰۲۵ء کے اختتام پر یہ قافلہ گیارہ ہزار (۱۱۰۰۰) سے متجاوز افراد پر مشتمل ہے۔ یہ کارواں قدم بہ قدم رواں دواں ہے۔ یہ بات بھی انتہائی اطمینان بخش ہے کہ ہمارے رفقاء میں عام و متوسط درجے کے افراد کے ساتھ انتہائی اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی بھی ایک قابلِ ذکر تعداد موجود ہے‘ جس کی وجہ سے ان شاء اللہ یہ قافلہ کبھی اپنے راستہ سے بھٹک نہ پائے گا اور نہ ہی کبھی قیادت کے فکری بحران کا اندیشہ ہے۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

آیئے! اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کریں کہ یہ قافلہ اسی طرح رواں دواں رہے۔ رفقائے تنظیم اسی طرح غلبۂ دین کی جِدّ و جُہد میں جان و مال کھپاتے رہیں‘ یہاں تک کہ کُرّۂ ارضی پر غلبۂ دینِ حق کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے۔ اس طرح ہم تمام رفقائے تنظیم بھی اللہ جل جلالہٗ کے ہاں سرخرو ہو جائیں۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

اسلامی تحریکوں کے ذِمّہ داران کے مطلوبہ اوصاف

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ

ہر تنظیم بنیادی طور پر دو قسم کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ تنظیمی لحاظ سے دونوں کی حیثیتیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں اور ان کی ذمہ داریاں بھی جدا جدا ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو اُس تنظیم میں اعضائے رئیسہ کا سا مقام رکھتے ہیں‘ اور باقی تمام لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی حیثیت عام اجزائے جسم کی سی ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی اجتماعی ادارہ نہ تو صرف اعضائے رئیسہ کی بدولت برقرار رہ سکتا ہے‘ نہ صرف عام اعضاء و جوارح کے بل پر زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کی زندگی‘ اس کی توانائی اور اس کی ترقی کے لیے چند چیزیں انتہائی حد تک ناگزیر ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ہی قسم کے لوگ اپنی اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک طور سے ادا کرتے رہیں‘ انہیں اپنی اپنی حدود بھی معلوم ہوں اور اپنے فرائض کا بھی پورا پورا احساس ہو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی اس علم اور اس احساس میں کوتاہ رہا تو یہ اجتماعی ادارہ ڈیڑھ پہیے کی گاڑی بن کر رہ جائے گا۔ اگر کوتاہی و خام کاری کے مرض میں دونوں ہی مبتلا رہے تو پھر گاڑی ٹوٹے ہوئے پہیوں پر بُری طرح ہچکولے کھاتی ہوئی بس جوں توں گھسٹتی رہے گی‘ اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب کس کھڈ میں جا گرے۔

اسلام نے اپنے پیروؤں کو بالعموم ہر کام اجتماعی شکل میں اور نظم کے ساتھ انجام دینے کی ہدایتیں دی ہیں۔ ان کا بیّن تقاضا ہے کہ اس دین کی حمایت اور نصرت و اقامت کے لیے قائم کی جانے والی تحریکیں بھی ان کے تقاضوں کو اچھی طرح محفوظ رکھیں‘ اور منظم طور سے اپنی منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھائیں۔ اسلامی تحریکوں یا تنظیموں کے ’’اعضائے رئیسہ‘‘ جماعتی ذمہ دار اور اُمراء کہلاتے ہیں‘ اور عام اعضاء و جوارح ان کے ماتحت یا ’’مامورین‘‘ ہوتے ہیں۔ خدا اور اُس

کے رسول ﷺ نے ان دونوں ہی قسم کے لوگوں کی ذمہ داریوں کو بڑی وضاحت سے بیان فرما رکھا ہے‘ اور ان اخلاقیات پر بھی پوری طرح روشنی ڈال دی ہے جن کی اس خصوص میں نمایاں اہمیت ہے۔ میں اِس وقت صرف انہی ذمہ داریوں اور انہی اخلاقی صفات کی یاددہانی کرانا چاہتا ہوں جو اسلامی تحریکوں کے اصحابِ امر سے‘ خواہ وہ کسی درجے اور حیثیت کے ہوں‘ تعلق رکھتی ہیں۔

ایک جامع الفرائض دعا

قرآن کریم کی ایک دعائیہ آیت کا آخری ٹکڑا ہے:

﴿...وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝۷۴﴾ (الفرقان)

’’.....اور (اے پروردگار!) ہمیں متقیوں کا سربراہ بنا۔‘‘

اس دعا کا سادہ انداز میں مفہوم یہ ہے کہ خدایا! جو لوگ ہماری ماتحتی اور نگرانی میں ہیں انہیں تقویٰ کی راہ پر چلا۔

تین لفظوں کا یہ دعائیہ جملہ جوامع الکلم میں سے ہے‘ اور ایک فرض شناس مسلمان کی نگہ جستجو کے لیے اس میں سب کچھ موجود ہے۔ یہ اگرچہ بظاہر صرف ایک دعا ہے‘ مگر اس دعا کے پس منظر میں ان سبھی واجبات اور صفات کے مطالبے موجود ہیں جن سے ہم اہلِ ایمان کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ جب ایک مردِ مؤمن اپنے ربّ سے یہ التجا کر رہا ہوتا ہے کہ وہ اسے اہلِ تقویٰ کا سربراہ بنا دے‘ تو یہ التجا دعا ہونے کے ساتھ ساتھ لازماً اس عہد پر بھی مشتمل ہوتی ہے کہ اپنی استطاعت کی حد تک میں خود بھی اس مدّعا و مطلوب کے حصول کے لیے کوشاں رہوں گا‘ کیونکہ دعا صحیح معنوں میں دعا ہوتی ہی اُس وقت ہے جب اس کا رشتہ دعا کرنے والے کی اپنی ممکنہ کوششوں سے جڑا ہوا ہو۔ آدمی اپنے مطلوب کے لیے خود تو کچھ نہ کرے‘ اور صرف یاربّ یاربّ پکارتا رہے تو یہ دعا نہیں‘ تمنی علی اللہ ہوگی‘ جو نہ عقلاً کوئی پسندیدہ چیز ہے نہ شرعاً۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اہلِ ایمان کو ’’اِجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا‘‘ کی دعا کے ساتھ ساتھ کیا کوششیں انجام دینا اور دیتے رہنا چاہیے کہ ان کی یہ عظیم المقاصد دعا صحیح معنوں میں دعا بن جائے‘ تمنی علی اللہ بن کر نہ رہ جائے؟ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ دعا کرنے والا اپنے جن زیرِ اثر اور ماتحت لوگوں کو متقی دیکھنا چاہتا ہے‘ انہیں تقویٰ کی صفات سے آراستہ کر دینے یا آراستہ بنائے رکھنے کی جس طرح وہ خدا سے التجا کرتا ہے‘ اسی طرح اس مقصد کی خاطر خود بھی سعی

وتدبیر کرتا رہے‘ اور اپنے ماتحتوں کو تقویٰ کے مقام تک پہنچا دینے میں اپنی سی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھے۔ لیکن ذرا ٹھہریے‘ یہ جواب ابھی تشنہ ہے‘ اور یہ مکمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب معاملہ کا ایک اور اہم پہلو بھی سامنے آ جائے۔ وہ یہ کہ ’’اِجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا‘‘ کی دعا میں اگرچہ ذکر تو صرف ماتحتوں کے صاحبِ تقویٰ ہونے یا بنائے جانے کی التجا کا ہے‘ مگر لفظوں میں مذکور نہ ہونے کے باوجود اس التجا سے پہلے ایک اور اہم تر التجا بھی اس دعا میں موجود ہے‘ اور وہ یہ ہے کہ خدایا! خود ہمیں بھی نہ صرف متقی بلکہ ان سب سے بڑھ کر متقی بنا دے۔ یہ بالکل بے معنی سی بات اور بڑی بے جا قسم کی جسارت ہوگی کہ آدمی خود تو تقویٰ کے معاملہ میں کچھ یوں ہی سا ہو‘ مگر اللہ تعالیٰ سے عرض پر عرض کرتا رہے کہ وہ اسے متقیوں کا امام بنا دے۔ ایسی عرض و معروض تو اسی شخص کو زیب دے سکتی ہے جو خود بھی صاحبِ تقویٰ ہو اور تقویٰ کی صفت سے اپنے کو بیش از بیش بہرہ ور کرتے رہنے کی بصدقِ دل التجا کرتا رہے‘ بلکہ اَتْقٰی یعنی دوسروں سے بڑھ کر متقی ہو‘ یا اَتْقٰی بن جانے کی فکر اور کوشش میں ہو۔ مذکورہ بالا سوال کا یہ مکمل جواب سامنے آ جانے کے بعد واضح طور پر اہلِ ایمان کی ذمہ داریاں دوگونہ قرار پا جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ تقویٰ اور خدا پرستی کی راہ میں اپنے کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھاتے رہیں‘ دوسری یہ کہ اپنے ماتحت افراد کو بھی اس مدارِ دین ایمانی صفت سے بہرہ ور کرتے رہنے کے لیے برابر فکرمند اور کوشاں رہیں‘ اور پھر دونوں ہی باتوں کے لیے خدا سے سچی دعائیں بھی کرتے رہیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نظر میں رہنی چاہیے کہ تقویٰ کی صفت بجائے خود تو مطلوبِ دین ہے ہی‘ ساتھ ہی اس لیے بھی مطلوب اور ضروری ہے کہ جب تک پیروانِ اسلام کے اندر یہ ایمانی جوہر ایک معقول حد تک موجود نہ ہو اُس وقت تک اسلام اپنے پورے وجود کا مظاہرہ کر ہی نہیں سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ جو نظامِ رحمت لے کر آیا ہے وہ خدا کی زمین پر ہرگز قائم نہیں ہو سکتا‘ اور اگر پہلے سے قائم ہو تو اپنی جگہ برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کوئی بھی اسلامی تحریک اپنے سفر کے اس اصل زادِ راہ سے تہی دامن رہ کر‘ یا اس کی محض معمولی سی مقدار کے بل پر کبھی قدم آگے نہیں بڑھا سکتی۔

ان تمہیدی‘ مگر بنیادی نکتوں کے واضح ہو جانے کے بعد اب ان اہم صفات کو ذہن نشین کر لیں جو کسی اسلامی تحریک کے ذمہ داروں میں خصوصی اہمیت کے ساتھ لازماً پائی جانی چاہئیں‘ اور جن کی موجودگی پر ہی اس تحریک کی کامیاب پیش قدمی بہت بڑی حد تک موقوف رہتی ہے۔

(۱) احتسابِ نفس

سب سے پہلی اور سب سے اہم صفت تو احتسابِ نفس کی صفت ہے۔ جب تک اس احتساب پر بھرپور توجّہ نہ رہے گی اُس وقت تک یہ ذمہ دارانِ تحریک ان صلاحیتوں اور صالحیتوں کے مالک بن ہی نہیں سکتے جو تحریک میں اقدام کی روح دوڑا سکتی اور اسے ترقی کی راہ پر رواں دواں رکھ سکتی ہیں۔ پس مبالغہ نہ ہوگا اگر احتسابِ نفس کو تحریک کی کامیابی کی شاہِ کلید سمجھا جائے۔

یہ احتساب کیوں ضروری ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا نظری جواب اگرچہ ہم سب جانتے ہیں‘ مگر موضوعِ گفتگو کی اہمیت چاہتی ہے کہ اس جانے ہوئے جواب کو پھر سے جان لیا جائے‘ تاکہ وہ ذہن میں تازہ ہو رہے۔ یہ جواب جس قدر معلوم اور واضح ہے اسی قدر اس کے تقاضوں کو پورا کرنا دشوار‘ اور اس کا عملی نتیجہ کم یاب ہے۔ کون نہیں جانتا کہ نفس کی کیادی (مکروفریب) بے مثال اور اس کے حملوں کی شدت بے نظیر ہوتی ہے۔ یہ حملے اتنے شاطرانہ انداز کے‘ اور اس طرح چھپ چھپ کر ہوا کرتے ہیں کہ بس حضرات انبیاء علیہم السلام ہی اس سے پوری طرح محفوظ رہ سکے ہیں۔ آدمی کو محسوس تک نہیں ہو پاتا اور وہ متاعِ دین و ایمان لوٹ لے جاتا ہے۔ یہ نفس جس شیطانِ اعظم کا ایجنٹ ہے وہ عین دربارِ خداوندی میں چیلنج دے آیا ہے کہ میں ابن آدم کو اپنی گرفت میں لے لینے کی کوئی تدبیر اور کوشش اٹھا نہ رکھوں گا‘ اور اس پر سامنے سے‘ پیچھے سے‘ دائیں سے‘ بائیں سے‘ غرض ہر جہت اور ہر رُخ سے چھاپے ماروں گا۔ پوری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اس نے جو عہد کیا تھا اسے پورا کر دکھانے میں کم از کم اسّی نوے فی صد تو بہرحال کامیاب رہا۔ کوئی چالاک دشمن جب بھی اپنے حریف پر دھاوا مارتا ہے تو اس کی طاقت کا اندازہ لگا کر مارتا ہے۔ شیطان اور اس کا ایجنٹ نفسِ امّارہ اس اصولِ جنگ کے ماہر ہیں۔ جو افرادِ انسانی جتنے ہی زیادہ قوی الایمان اور صاحبِ علم و عرفان ہوتے ہیں انہیں پھانس لینے کے لیے وہ اتنا ہی زیادہ مضبوط آہنی جال بچھاتے رہتے ہیں‘ اور اگر وہ قوی الایمان اور صاحبِ علم و عرفان ہونے کے ساتھ ساتھ نصرتِ دین کے مردِ میدان بھی ہوں تو وہ اپنے اس آہنی جال کی کڑیوں کو اور زیادہ کس دیتے ہیں۔

صحیح معنوں کی اسلامی تحریکوں سے بڑھ کر اس موذی کا مبغوض اور کوئی نہیں ہوتا۔ وہ

بڑے سے بڑے عابدوں اور زاہدوں کو تو شاید کچھ دیر کے لیے برداشت کر لے‘ مگر دینِ حق کا علَم اٹھانے والوں کو ایک آن بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اس جنگی تدبیر سے بھی بخوبی آگاہ ہے کہ غنیم کے لشکر کو تہ و بالا کر کے رکھ دینے کی سب سے کارگر شکل یہ ہے کہ اس لشکر کے سالاروں اور کمانڈروں کا کام تمام کر دیا جائے‘ پھر باقی فوج آپ سے آپ سفید جھنڈے لہرانے لگے گی۔ یہ خوف ناک حقیقت متنبہ کرتی ہے کہ اسلامی تحریکوں کے عام ارکان بالعموم اور ان کے ذمہ دار بالخصوص‘ نفس اور شیطان کی طرف سے برابر چوکنے رہیں۔ ایک طرف تو انہیں ان کے شر سے خدا کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے‘ دوسری طرف اپنے اندرون میں جھانک کر دیکھتے رہنا چاہیے کہ کہیں شیطان نقب تو نہیں لگا رہا ہے۔ ان دوگونہ فکرمندیوں اور کوششوں کے بعد ہی اس توقع کا رکھنا حق بجانب ہو سکتا ہے کہ اس کے مذموم عزائم کامیاب نہ ہونے پائیں گے۔

احتسابِ نفس کے پہلو ایک دو نہیں‘ بہت سے ہیں۔ مَیں یہاں صرف دو اہم ترین پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانے پر اکتفا کروں گا۔

(i) اخلاصِ نیت: پہلی چیز جسے اس احتساب کے سلسلے میں خصوصیت سے ملحوظ رکھنا چاہیے‘ نیت کا اخلاص ہے۔ اہلِ ایمان کی نیتوں کا خلوص شیطان کے لیے حد درجہ سوہانِ روح ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی شعلہ بار نگاہیں اسے برابر گھورتی رہتی ہیں۔ اس کے لیے یہ لڑائی کا ایسا محاذ ہوتا ہے جسے وہ سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے‘ اور اگر اسے توڑ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو دوسرے سارے مورچے آپ سے آپ ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ گویا اکیلے اِس محاذ کا ختم ہو جانا پوری لڑائی کے ہار جانے کے ہم معنی ہوتا ہے‘ کیونکہ اس کے بعد نہ نماز‘ نماز رہ جاتی ہے اور نہ زکوٰۃ‘ زکوٰۃ رہ جاتی ہے۔ دعوت الی اللہ‘ نصرتِ اسلام اور اقامتِ دین کے صرف دعوے اور الفاظ رہ جاتے ہیں۔ ان کے اندر سے معنویت اسی طرح غائب ہو جاتی ہے جس طرح دل کی حرکت بند ہو جانے سے جسم سے زندگی ناپید ہو رہتی ہے۔ اس خوف ناک بلا کے خطروں سے مامون تو کوئی بھی نہیں ہوتا‘ مگر جو شخص جتنی ہی زیادہ نمایاں دینی پوزیشن رکھتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ ان خطروں کی زد میں رہتا ہے۔ اسلامی تحریکوں کے ذمہ دار اور اصحابِ امر‘ خواہ وہ کسی درجے کے ہوں‘ اپنے اپنے دائروں میں بہرحال ایک خاص پوزیشن کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ پوزیشن بجائے خود بھی کمزور آدمی کے لیے فتنہ کا سامان بن سکتی ہے۔ نفس آسانی سے اسے یہ وہم دلا سکتا

ہے کہ امارت کا یہ منصب اس کے لیے ایک اعزاز اور وجہِ افتخار ہے‘ حالانکہ فی الاصل وہ ایک بھاری ذمہ داری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اگر اس منصب کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عنایت نے اسے کسی مخصوص اور نمایاں قسم کی صلاحیت سے بھی نواز رکھا ہو‘ مثلاً تحریر و تصنیف کی صلاحیت‘ یا تقریر و خطابت کی صلاحیت‘ یا مؤثر افہام و تفہیم کی صلاحیت‘ یا حسنِ کارکردگی کی صلاحیت‘ تو پھر خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے اور غافل شخص بڑی آسانی سے تعلّی کا شکار اور شہرت کا حریص بن جاتا ہے۔ اپنی کسی اچھی صلاحیت پر لوگوں کی تحسین سے خوشی محسوس کرنا تو کوئی معیوب بات نہیں‘ مگر جب یہ خوشی آگے بڑھ کر اپنی شخصیت کی بلند قامتی کے احساسِ فخر میں تبدیل ہو جائے تو پھر بڑی تباہ کن بیماری بن جاتی ہے۔ اس طرح کا احساس نہ صرف یہ کہ بجائے خود ایک انتہائی ناپسندیدہ چیز ہے‘ بلکہ وہ تحریر و تقریر کے مٹھ کو بھی مار دیتا ہے اور بات کا اثر بس اپنی ایک لپک سی دکھا کر ختم ہو رہتا ہے۔ یہ اس تحریک کے حق میں ایک بڑی خیانت اور ایک بڑا ظلم ہے جس نے اسے امارت کی کوئی چھوٹی یا بڑی ذمہ داری سپرد کی ہوتی ہے۔

(ii) شرائع کی پابندی میں عزیمت کا رویہ: احتسابِ نفس کے ضمن میں تحریکی نقطۂ نظر سے دوسری اہم چیز یہ ہے کہ ذمہ دارانِ تحریک کو شرائع کی پابندی میں‘ بالخصوص ان کی دونوں عملی بنیادوں‘ نماز اور زکوٰۃ کے بارے میں‘ نسبتاً زیادہ عزیمت کا رویہ اختیار کیے رہنا چاہیے اور معمولی معمولی عذرات کی آڑ ہرگز نہ لینی چاہیے۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک بار ایک نابینا صحابیؓ نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ ’’میں ایک اندھا آدمی ہوں اور مدینہ کی بستی میں سانپ‘ بچھو اور درندے کثرت سے نکلا کرتے ہیں۔ کوئی ایسا شخص بھی میسر نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دیا کرے‘ اس لیے حضورؐ اجازت دے دیں کہ میں نماز گھر ہی میں پڑھ لیا کروں‘‘۔ آپؐ نے اجازت مرحمت فرما دی۔ اجازت حاصل کر کے جب وہ صاحب لوٹ کر جانے لگے تو انہیں واپس بلا کر آپ ﷺ نے پوچھا: ((هَلْ تَسْمَعُ النِّدَاءَ بِالصَّلَاةِ؟)) ’’کیا تمہیں نماز کی اذان سنائی دیا کرتی ہے؟‘‘ انہوں نے جواب دیا: ’’نَعَمْ‘‘ (ہاں حضورؐ! سنائی تو دیتی ہے) یہ سن کر آپ ﷺ نے انہیں ہدایت فرمائی: ((فَأَجِبْ))[1] ’’تو پھر اس کا جواب دیا کرو‘‘۔ یعنی

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب یجب اتیان المسجد علی من سمع النداء، ح۱۴۸۶۔

پھر تو تمہیں مسجد آنا ہی چاہیے۔ اس حدیث سے اندازہ لگائیے کہ عام اور معمولی عذرات کی بات اللہ و رسول ﷺ کی نظر میں کتنی بے وزن ٹھہرا کرتی ہوگی!

فقہی رخصتوں کا معاملہ بھی عذرات کے معاملے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اصحابِ امر کو ان رخصتوں سے فائدہ اٹھانا بالکل زیب نہیں دیتا‘ اِلا آنکہ خود شریعت ہی نے کسی رخصت پر عمل کرنے کو واجب یا مستحسن قرار دے رکھا ہو۔ رخصتوں سے فائدہ اٹھانے کا مزاج دراصل دینی مزاج کی خامی پر دلالت کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ دینی مزاج کی خامی ایک عام مسلمان اور ایک عام فردِ تنظیم کے حق میں بھی کچھ کم افسوس ناک چیز نہیں‘ لیکن تحریک اسلامی کے اصحابِ امر کے حق میں تو اسے قابلِ ملامت ہی کہا جائے گا‘ کیونکہ اس خامی کے اثرات صرف انہی کی ذات تک محدود نہ رہیں گے‘ بلکہ اس کا کچھ نہ کچھ اثر ان کے مأمورین پر بھی پڑ کر رہے گا۔ یہ تحریک کا اتنا بڑا زیاں ہوگا جسے کوئی بھی حساس شخص انگیز کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔

(۲) اصحابِ امر کا مأمورین کے ساتھ رویّہ

یہ تو وہ خاص خاص اہم باتیں تھیں جو اصحابِ امر کے اپنے احتسابِ نفس اور اپنی اصلاحِ ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب ان ذمہ داریوں کی طرف آیئے جو اُن پر اُن کے مأمورین کی نسبت سے عائد ہوتی ہیں‘ تاکہ معلوم ہو جائے کہ اصحابِ امر کو اپنے منصبی فرائض انجام دینے کے لیے کن صفات سے خاص طور پر متصف ہونا اور کن طور طریقوں پر کاربند رہنا ضروری ہے۔

اس بحث کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ اصحابِ امر اور ان کے مأمورین کے درمیان ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس سوال کا واضح اصولی جواب رسول اکرم ﷺ کے اس مشہور ارشاد میں موجود ہے:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، اَلْاِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ...الخ))[2]

’’تم میں سے ہر شخص راعی اور نگران ہے اور تم سب کو اپنی رعیتوں کے بارے میں

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجمعۃ، باب الجمعۃ فی القری والمدن، ح۸۹۳۔ وصحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل و عقوبۃ الجائر و الحث علی الرفق ..... ح ۴۷۲۴۔

جواب دہی کرنی ہوگی۔ مسلمانوں کا سربراہ ایک راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا.....''

یہ فرما کر آپ ﷺ نے چند اور اقسام کے راعیوں اور ان کی رعیتوں کی نام بہ نام مثالیں دے کر بات کو پوری طرح واضح کر دیا۔ اس ارشادِ نبویؐ کے مطابق تحریکوں کے ذمہ دار اور اصحابِ امر بھی ایک خاص نوعیت کے راعی اور نگران قرار پاتے ہیں' اور دنیا اور آخرت دونوں ہی جگہ وہ اپنی اپنی رعیتوں کے یعنی اپنے مأمورین اور اپنے زیرِ نگرانی افرادِ تحریک کے بارے میں جواب دہ ٹھہرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اتنی بڑی ذمہ داری ہے جو راتوں کی نیند اڑا دے سکتی ہے' لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی انجام دہی کا اجر بھی بہت بڑا ہے۔

یہاں اس بھاری ذمہ داری کی نوعیت بھی سمجھ لینی چاہیے۔ یہ ایک واضح اصولی بات ہے کہ مختلف قسم کے راعیوں کی ذمہ داریاں مختلف نوعیتوں کی ہوں گی جن کا تعین ان راعیوں کی رعیتوں کے مفاد اور مصالح کی بنیاد ہی پر ہوگا۔ اس اصول کی روشنی میں تحریکی ذمہ داریاں اور مسئولیتیں اپنے مأمورین کے تئیں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتیں کہ جس مقصد کی خاطر یہ لوگ ان کی رہنمائی اور نگرانی میں دیے گئے ہیں وہ انہیں اس مقصد کے کام کے آدمی بنائیں۔ ان کے اندر اپنے تحریکی نصب العین کے حق میں زیادہ سے زیادہ ذہنی یکسوئی پیدا کریں۔ اس کی خاطر جِدّ و جُہد کا حوصلہ پروان چڑھائیں۔ ان انفرادی اور اجتماعی اوصاف سے انہیں بیش از بیش آراستہ کرتے رہنے کی فکر اور کوشش کریں جو تحریک کو مطلوب اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب ہیں۔

اصحابِ امر اور مأمورین کے درمیان تحریکی تعلق کی نوعیت اور اس کے تقاضے معلوم ہو جانے کے بعد اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن صفات سے جن کا حامل ہونا اور ان رویوں سے جن کا اختیار کرنا اصحابِ امر کے لیے ضروری ہے' واقفیت حاصل کر لی جائے۔

(i) نرم خوئی و نرم گیری: پہلی ضروری چیز نرمی اور لینت کی صفت ہے۔ اصحابِ امر کو اپنے مأمورین کے ساتھ ممکن حد تک نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے' اور اگر کبھی خود مفادِ تحریک کا تقاضا ہو کہ ان پر گرفت کی جائے تو اس گرفت میں بھی حتی الوسع سخت گیری سے بچنا چاہیے۔ پھر اتنی بات بھی کافی نہیں ہے کہ یہ نرم رویہ محض تدبیر اور پالیسی کے طور پر اپنا لیا گیا ہو' بلکہ مطلوب یہ ہے کہ یہ تا حدِ امکان ان کا مزاج بن گیا ہو۔ یہ روش اور صفت سب سے زیادہ جس چیز کے لیے اہمیت

رکھتی ہے وہ تحریک کی ہیئتِ اجتماعیہ ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ہیئتِ اجتماعیہ اپنی صحت اور اپنے اندرونی استحکام کے لیے بڑی حد تک اصحابِ امر کی اسی نرم روی پر انحصار کرتی ہے۔ جہاں کسی تحریک کا اجتماعی نظم اپنے اس سامانِ بقا سے محروم ہوا' اس کا نظامِ اعصاب اسی طرح ٹوٹ کر رہ جائے گا جس طرح کسی زلزلے کے بعد پختہ عمارتیں بھی اندر سے چیخ کر رہ جاتی ہیں۔ انسانی فطرت کے خالق نے کسی اور کو نہیں' خود اپنے پیغمبرِ اعظم ﷺ کو ایک بڑے اہم واقعہ کے بعد مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

''سو یہ اللہ ہی کی مہربانی تھی کہ تم (اپنے) اِن (ساتھی اہلِ ایمان) کے لیے نرم ہو' ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے لازماً چھٹ گئے ہوتے۔''

سوچیے اور بار بار سوچیے کہ جب تند خوئی اور سخت دلی کے ساتھ رسالت پناہ جیسی عظیم اور بے مثال شخصیت کے لیے بھی اپنے لوگوں کی جمعیت کو برقرار رکھ سکنا ممکن نہ ہوتا تو دوسرے کس شمار و قطار میں ہیں؟ معلوم ہوا کہ نرم مزاجی جہاں انسان کی سیرت کا ایک دلکش حسن ہے' وہاں اپنوں کو مضبوطی سے جوڑے رکھنے کا ایک ناگزیر ذریعہ بھی ہے۔ اس کے بغیر تحریک کا اجتماعی نظم پائیدار ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ نرم خوئی کس پائے کی ایمانی صفت ہے' اسے جاننے اور سمجھنے کے لیے قرآن کریم کا یہ بیان کافی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی نرم مزاجی تو فی الواقع اللہ تعالیٰ کی رحمت کا خاص عطیہ تھی۔ آنحضرت ﷺ نے بھی اس وصف کی غیر معمولی اہمیت کا اظہار اِن لفظوں میں کیا ہے:

((مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ)) (۳)

''جو شخص نرم مزاجی سے محروم ہو وہ (گویا ہر طرح کی) بھلائی سے محروم ہے۔''

غور کیجیے کہ جب نرم مزاجی سے محرومی آدمی کی اپنی شخصی زندگی میں ساری بھلائیوں سے محرومی کا باعث بن جاتی ہے تو یہ جماعتی زندگی کے لیے کیا کچھ مصیبتیں نہ پیدا کر دے گی' اگر خدانخواستہ اس کے اصحابِ امر اس محرومی کا شکار ہوں!

نرم خوئی' رفق اور لینت سے محرومی کے معنی تند خوئی اور سخت گیری کے ہیں۔ سخت مزاج اُمراء و حکام نبی اکرم ﷺ کی نگاہ میں اتنے بڑے مجرم ہیں کہ رحمۃٌ للعالمین اور رؤف و رحیم

(۳) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الرفق، ح ۶۶۰۰۔

ہونے کے باوجود آپؐ اُن کے حق میں دلوں کو ہلا دینے والی یہ بددعا کرنے پر مجبور ہو گئے:

((اَللّٰھُمَّ مَنْ وَلِیَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِیْ شَیْئًا فَشَقَّ عَلَیْھِمْ فَاشْقُقْ عَلَیْہِ))(۴)

''اے اللہ! جو کوئی میری اُمت کے کسی معاملے کا ذمہ دار ہو اور وہ لوگوں پر سختی کرے تو تُو اس پر سختی کر۔''

سختی اور سخت گیری کا یہ ہولناک انجام سامنے رکھیے تو نرمی اور نرم خوئی کی قدر و قیمت آپ سے آپ معلوم ہو جائے گی۔

(ii) عفو و درگزر: نرم خوئی اور لینت سے نہایت قریبی تعلق رکھنے والی ایک خاص صفت جماعتی معاملات میں عفو و درگزر سے کام لینے کی صفت ہے' جس سے اصحابِ امر کا خصوصیت سے متصف رہنا انتہائی ضروری ہے۔ عفو و درگزر کی مدح و منقبت سے اور اس کی ترغیب و تاکید سے کتابِ الٰہی بھری پڑی ہے' اور رسولِ خدا ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر مسلمانوں کے ایک گروہ کی غلطی سے لڑائی کا پانسا یکایک مشرکوں کے حق میں پلٹ گیا اور اس کے نتیجے میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کا اور خود نبی اکرم ﷺ کے زخمی ہو جانے کا الم ناک سانحہ پیش آ گیا تھا۔ مسلمانوں کی یہ غلطی کوئی معمولی غلطی نہ تھی۔ دنیا کا کوئی اور سپہ سالار ہوتا تو ایسے لوگوں کا کورٹ مارشل کر کے انہیں بدترین سزائیں دیے بغیر ہرگز نہ چھوڑتا' لیکن حضور اکرم ﷺ نے اپنے ان خطا کار لشکریوں کے حق میں کسی اقدام کی بات سوچی تک نہ تھی اور عفو عام سے کام لیا۔ اس کی اللہ تعالیٰ نے نہ صرف تصویب فرمائی' بلکہ تحسین بھی کی اور اسے اپنی رحمت کا ثمرہ قرار دیا۔ پھر اس تحسین ہی پر اکتفا نہیں کر لیا بلکہ ساتھ ہی آپ ﷺ کو اس بات کی ہدایت بھی کی کہ:

﴿فَاعْفُ عَنْھُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَھُمْ وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ﴾ (آلِ عمران:۱۵۹)

''پس انہیں معاف کر دو اور ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگو' اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔''

مقصود اس ہدایت کا یہ تھا کہ انہیں معاف کرنے ہی تک اپنی روش کو محدود نہ رکھیے' بلکہ آگے بھی ایسا رویہ اختیار کیجیے جس سے انہیں اطمینان ہو جائے کہ یہ معافی کوئی رسمی اور قانونی

(۴) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر والحث علی الرفق۔

معافی نہیں ہے بلکہ حقیقی معافی ہے۔ زبانِ مبارک ہی نے نہیں' قلبِ اطہر نے بھی انہیں معاف کر دیا ہے اور اب ان سے سرزد ہو جانے والی غلطی کا کوئی انقباضی اثر آپؐ پر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ مقتدائے عالم ﷺ کو دی جانے والی اس ہدایت میں عام افرادِ اُمّت کے لیے بالعموم اور کسی طرح کی جماعتی ذمہ داریاں رکھنے والوں کے لیے بالخصوص رہنمائی کا پورا سامان موجود ہے۔ یہ اس امر کی کھلی ہوئی تلقین ہے کہ جماعتی معاملات میں اگر عام افراد سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اصحابِ امر کو عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے' اور یہ کہ یہ عفو و درگزر صدقِ دل سے ہو' محض قانونی انداز کا نہ ہو۔ بلاشبہ یہ کوئی لازمی کلیہ نہیں ہے اور بعض اوقات خود تحریک ہی کا مفاد تقاضا کرتا ہے کہ اس موقع پر سرزنش سے کام لیا جائے' لیکن یہ استثنائی صورتیں ہوتی ہیں۔ عام روش عفو و درگزر ہی کی رہنی چاہیے' اس کے بغیر جماعتی نظم میں باہمی حسنِ تعلق قائم نہیں رہ سکتا۔

(iii) صبر و تحمل: نرم خوئی سے ایسا ہی قریبی تعلق رکھنے والی ایک اور بھی ضروری صفت صبر و تحمل کی صفت ہے۔ یہاں صبر و تحمل سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات پر ناروا حملوں کے موقع پر اپنا غصہ پی جائے۔ اشتعال انگیز حالات میں برداشت سے کام لینا عام طور سے بہت مشکل ہوتا ہے' مگر جس قدر یہ چیز کڑوی ہے اسی قدر اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ تحریکی زندگی کے لیے تو یہ پھل مقوی غذا کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی اسلامی تحریک کے سربراہ اگر خدانخواستہ اپنے اندر صبر و تحمل کا مادہ نہ رکھتے ہوں تو صرف ان کی اپنی ذات ہی نہیں' تحریک بھی اس کا خمیازہ بھگتنے سے نہیں بچ سکتی۔ اصحابِ امر کو اپنی ذات پر ہونے والی ناروا تنقیدوں سے سابقہ پیش آنا کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ ہر تنظیم میں ایسے خام کار لوگ موجود ہوا ہی کرتے ہیں جو حدود کا لحاظ نہیں رکھ پاتے۔ ایسے لوگوں کی طرف سے اگر اشتعال انگیز حرکتیں ہو جائیں تو ان پر غصہ کا آنا فطری ہے اور یہ شرعاً بھی کوئی مذموم چیز نہیں ہے۔ مذموم بات صرف یہ ہے کہ غصہ کے عالم میں صبر و تحمل کا دامن چھوڑ دیا جائے۔ زندگی کے ہر معاملے کی طرح اس معاملے میں بھی نبی اکرم ﷺ کا اُسوہ ایک مسلمان کے لیے واجب الاتباع ہے۔ آپ ﷺ کی پوری زندگی بتاتی ہے کہ آپؐ نے اپنی ذات کے خلاف ہونے والی کسی زیادتی کا کبھی انتقام نہیں لیا' بلکہ ہر بات پر صبر کیا۔ مثال کے طور پر دو واقعات کا سن لینا کافی ہوگا۔

پہلا واقعہ غزوۂ حنین کے موقع کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

جنگ حنین میں حاصل ہونے والے اموالِ غنیمت کو رسول اللہ ﷺ نے جب لوگوں میں تقسیم کیا تو (دعوتِ اسلامی کے پیشِ نظر) کچھ اشرافِ عرب کو باقی لوگوں پر اس معاملے میں ترجیح دی اور انہیں نسبتاً زیادہ دیا۔ ایک اَن گھڑ شخص نے یہ دیکھ کر یہاں تک کہہ دیا کہ: وَاللّٰہِ اِنَّ ھٰذِہِ الْقِسْمَۃُ مَا عُدِلَ فِیْھَا وَمَا اُرِیْدَ فِیْھَا وَجْہُ اللّٰہِ (بخدا یہ ایک غیر عادلانہ تقسیم ہے اور اس میں اللہ کی رضا کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے)۔ جب آپ ﷺ تک یہ بات پہنچی تو چہرۂ مبارک متغیر ہو گیا' یہاں تک کہ سرخ رنگ کی طرح لال ہو گیا' مگر صرف اتنا فرما کر آپ ﷺ خاموش ہو رہے کہ:

((فَمَنْ یَعْدِلُ اِذَا لَمْ یَعْدِلِ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ، رَحِمَ اللّٰہُ مُوْسٰی قَدْ اُوْذِیَ بِاَکْثَرَ مِنْ ھٰذَا فَصَبَرَ))(۵)

''اگر اللہ اور اس کا رسول ہی عدل نہ کریں گے تو پھر اور کون کر سکتا ہے؟'' پھر فرمایا:

''اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی رحمت سے نوازے' ان کی اس سے بھی بڑھ کر دل آزاری کی گئی تھی' مگر انہوں نے ہر بات پر صبر کیا۔''

دوسرا واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر لگائے جانے والے بہتانِ عظیم کا ہے۔ اس واقعے کے نتیجے میں مسلسل ایک ماہ تک نبی اکرم ﷺ نے جس قلبی اذیت کے ساتھ زندگی کے شب و روز گزارے' اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اتنا کچھ ہو جانے پر بھی صبر و تحمل کے اس پیکرِ مقدس نے ایسی عالی ظرفی سے کام لیا جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ دونوں واقعات ایسا آئینہ ہیں جس میں نبی اکرم ﷺ کی شانِ صبر و تحمل کی پوری کیفیت دیکھ لی جا سکتی ہے۔ آپ ﷺ کے اس اُسوہ میں افراد ہی کی ایمانی زندگی کا نہیں' جماعت کی بھی اندرونی صحت و توانائی کا راز چھپا ہوا ہے۔

(iii) فروتنی: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اُن کے اہلِ ایمان اصحاب رضی اللہ عنہم کے سلسلے میں جو مختلف ہدایتیں دی تھیں ان میں سے ایک اہم ہدایت یہ بھی تھی کہ:

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۱۵﴾ (الشُّعراء)

''اور اپنے اہلِ ایمان پیروؤں کے لیے اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھو۔''

''بازوؤں کو جھکائے رکھو'' یعنی فروتنی اور تواضع کا رویہ اپنائے رکھو۔ تواضع اگرچہ بجائے خود ایک

(۵) صحیح البخاری، کتاب فرض الخمس، باب ما کان النبی ﷺ یعطی المؤلفة قلوبهم وغیرهم...ح۳۱۵۰۔ وصحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب اعطاء المؤلفة قلوبهم علی الاسلام وتصبر من قوی ایمانه، ح۱۰۶۲۔

اعلیٰ انسانی جوہر اور ایمانی صفت ہے' لیکن آیت کا موقع کلام اور اس کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہاں آپ ﷺ کو اس کی تلقین دعوتِ اسلامی کے مفاد کے حصول میں کی گئی ہے۔ وہ مفادِ دعوت یہ تھا کہ آپ ﷺ کا متواضعانہ رویہ پیروانِ اسلام کے اندر آپؐ کی ذات اور دعوت دونوں سے گرویدگی پیدا کرے گا۔ جب حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے داعیٔ حق اور سربراہ کو بھی اپنے نصب العین کی خاطر کامیاب جِدّ و جُہد کرنے کے لیے اپنے پیروؤں کے ساتھ فروتنی کا رویہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی تو دوسروں کو یقینی طور پر بدرجۂ اولیٰ ہو گی' اور اس سے صرفِ نظر کر کے کوئی سربراہ بھی اپنے تحریکی منصب کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

فروتنی و خود شکنی کی روش اختیار کیے رہنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے' اور عام لوگوں کے مقابلے میں ان لوگوں کے لیے تو اور زیادہ مشکل ہے جو کوئی نمایاں پوزیشن رکھتے ہوں' کیونکہ یہ پوزیشن ان کے لیے ایک فتنہ بن جانے کے بڑے امکانات رکھتی ہے۔ اس لیے تحریکی سربراہوں کے لیے اس خلقِ کریم سے بہرہ ور ہونا بڑا ذہنی ریاض چاہتا ہے۔ اس ذہنی ریاض کی پہلی ضروری تدبیر یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کی صحیح نوعیت کا گہرا شعور حاصل ہو۔ پھر یاد کر لیجیے کہ کسی اسلامی تحریک میں مناصب کی حیثیت اصلاً نہ تو کسی استحقاق کی ہوتی ہے نہ کسی اعزاز کی ہوتی ہے' بلکہ ایک ہمت آزما بھاری ذمہ داری کی ہوتی ہے۔ اصحابِ امر کی فروتنی' اگر وہ فی الواقع فروتنی ہو' وہ کیمیا ہے جو انہیں زرِ خالص بنا دینے میں بڑا اہم رول انجام دیتی ہے۔ یہ بظاہر ایک پستی ہوتی ہے' مگر فی الواقع عظمت کا نشان ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے بشارت دی ہے کہ:

((مَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰہِ اِلَّا رَفَعَہُ اللّٰہُ))(۶)

''جو شخص اللہ کے لیے متواضعانہ روش اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلند کر کے رہتا ہے۔''

فروتنی اور تواضع کا یہ ثمرہ آدمی کی اپنی ذات کو تو ملتا ہی ہے' تحریک کو اس کا فائدہ اس سے بھی بڑھ کر ملتا ہے۔ ایسے اصحابِ امر اپنے مأمورین کی نگاہوں کا تارا بن جاتے ہیں' اور ان کی امارت ان لوگوں کے ظاہر ہی کی طرح ان کے دل اور دماغ پر بھی قائم ہو جاتی ہے۔ فی الواقع ایسے ہی اصحابِ امر وہ اصحابِ امر ہوتے ہیں جو اپنے مأمورین کے اندر اطاعتِ امر اور دعوتی

(۶) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو و التواضع، ح۶۵۹۲۔

جدّ و جُہد کا ولولہ پیدا کر سکتے ہیں‘ اسے بیدار رکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے مسلمانوں کے اچھے اُمراء اور حکام انہیں قرار دیا ہے جن سے ان کو دلی محبت ہو۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ، وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ))(۷)

’’تمہارے اچھے امام و پیشوا وہ ہیں جن کو تم محبوب رکھو اور جو تم سے محبت رکھیں‘ جن کے لیے تم دعائے رحمت کیا کرو اور جو تمہارے لیے دعائے رحمت کیا کریں۔‘‘

جیسا کہ ابھی اشارہ کیا جا چکا‘ اُمراء و ذمہ دارانِ تحریک کے لیے محبوبیت کے اس مقام کا حاصل ہونا بہت کچھ ان کے متواضعانہ رویے پر موقوف ہے۔

(iv) مأمورین کی خیرخواہی: اپنے زیر امارت افراد کی دلی خیرخواہی بھی ان خاص اور اہم صفات میں سے ایک ہے جن سے ذمہ دارانِ تحریک کا متصف رہنا ضروری ہے‘ ورنہ وہ کبھی کامیاب صاحبِ امر نہیں بن سکتے۔ یہ ان کے عین منصب کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے مأمورین کی بہی خواہی کو اپنے فکر و عمل کا جزو بنائے رکھیں۔ جہاں تک ممکن ہو ان کے نجی حالات سے بھی بے خبر نہ رہیں۔ اگر وہ کسی مشکل سے دوچار ہوں تو اس کے حل میں ان کی لازماً معاونت کریں۔ یہ ان کی شرعی ذمہ داری ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ:

((مَا مِنْ اَمِيْرٍ يَلِيْ اَمْرَ الْمُسْلِمِيْنَ، ثُمَّ لَا يَجْهَدُ لَهُمْ وَيَنْصَحُ، اِلَّا لَمْ يَدْخُلْ مَعَهُمُ الْجَنَّةَ))(۸)

’’ہر وہ امیر جو مسلمانوں کے معاملات کا نگران و ذمہ دار ہو‘ مگر وہ ان کے (بھلے کے) لیے جدّ و جُہد نہ کرے‘ نہ ان کی خیرخواہی کرے تو وہ ان کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔‘‘

اور یہ کہ:

((مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ شَيْئًا مِنْ اَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ فَاحْتَجَبَ دُوْنَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتِهِمْ وَفَقْرِهِمُ احْتَجَبَ اللّٰهُ عَنْهُ دُوْنَ حَاجَتِهٖ وَخَلَّتِهٖ وَفَقْرِهٖ))(۹)

(۷) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب خیار الائمۃ و شرارھم‘ ح۴۸۰۵۔
(۸) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب استحقاق الوالی الغاش لرعیتہ النار، ح۳۶۶۔
(۹) سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والفیء والامارۃ، باب فیما یلزم الامام من امر الرعیۃ والحجبۃ عنہ، ح ۲۹۴۸۔

’’جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کسی معاملے کا بھی والی و انتظام کار بنایا ہو وہ اگر ان کی ضرورتوں‘ حاجت مندیوں اور ناداریوں کے مسائل اپنے تک نہ پہنچنے دے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی ضرورتوں‘ حاجت مندیوں اور ناداریوں کی طرف سے پردہ کرے گا۔‘‘

اپنے مأمورین کے ساتھ خیرخواہی کا رویہ اختیار کرنے کی یہ اہمیت تو اُخروی نقطۂ نگاہ سے ہے۔ تحریکی اور تنظیمی نقطۂ نگاہ سے اس کی اہمیت یہ ہے کہ مأمورین کی نفسیات پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ایک طرف تو اپنے ذمہ داروں کے ساتھ ان کی محبت اور الفت میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف تحریک کے فروغ کے لیے ان کے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ متحرک سے متحرک تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی برعکس صورت میں نتائج اُلٹے نکلتے ہیں۔ ذمہ داروں اور مأمورین کے درمیان وہ قربت باقی نہیں رہتی جو رہنی چاہیے اور پھر تحریک کے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے طرزِ عمل کو یاد کیجیے۔ آپؐ عامۃ المسلمین کے ساتھ جس محبت‘ شفقت اور بہی خواہی کا برتاؤ کرتے تھے اور ان کی ضرورتوں اور مصلحتوں کا جتنا خیال رکھتے تھے‘ اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کر لیجیے۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ایک صحابیؓ کا یہ بیان مذکور ہے کہ ’’ہم کچھ نوجوان‘ جو سب کے سب تقریباً یکساں عمر کے تھے‘ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس بیس روز تک ٹھہرے رہے۔ آپ ﷺ بڑے رحم دل اور رقیق القلب تھے۔ آپؐ نے از خود محسوس کر لیا کہ ہمیں اپنے اہل و عیال کی یاد آ رہی ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی آپؐ نے ہم سے دریافت فرمایا کہ ’’تم لوگ اپنے گھروں پر کن کن کو چھوڑ کر آئے ہو؟‘‘ ہم نے جو بات تھی بتا دی۔ صورتِ حال معلوم کر کے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِرْجِعُوْا اِلٰى اَهْلِيْكُمْ، فَاَقِيْمُوْا فِيْهِمْ، وَعَلِّمُوْهُمْ وَمُرُوْهُمْ))(۱۰)

’’اپنے اہل و عیال کے پاس واپس جاؤ‘ ان کے درمیان مقیم رہو‘ اور انہیں دین سکھاتے رہو اور اچھے کاموں کی تلقین کرتے رہو۔‘‘

(۱۰) صحیح البخاری کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعۃ والاقامۃ وکذلک۔ وصحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ باب من احق بالامامۃ۔

(۷) اصلاح وتربیت کا حکیمانہ انداز: قرآن کریم نے دعوت الی اللہ کے جو اصولی طریقے تلقین فرمائے ہیں ان میں سے ایک ''موعظة حسنة'' کا اصول بھی ہے۔ اس ''موعظت حسنہ'' کے اصول کو اسلامی تحریکوں کے نظامِ تربیت کی ریڑھ کی ہڈی سمجھنا چاہیے۔ پند ونصیحت اگر مخلصانہ اور دردمندانہ ہونے کے ساتھ ساتھ حکمت کا انداز بھی لیے ہوئے ہو تو اپنا اثر دکھا کر رہتی ہے اور اصلاح وتربیت کے سو پروگراموں اور رسمی تدبیروں پر بھاری ثابت ہوتی ہے۔ مربّیٔ اعظم ﷺ اصلاح وتربیت کا عام طور سے جو طریقہ اپنایا کرتے تھے اور اس کے جو نتائج نکلتے تھے اس کی صرف دو مثالیں سن لیجیے۔

سنن ابی داؤد کی روایت ہے کہ ایک بار آپ ﷺ نے حضرت خریم الاسدی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

((نِعْمَ الرَّجُلُ خُرَيْمٌ الْأَسَدِيُّ لَوْ لَا طُوْلُ جُمَّتِهٖ وَإِسْبَالُ إِزَارِهٖ))(۱۱)

''خریم بڑے اچھے آدمی ہیں' کاش ان کے بالوں کی لٹ اتنی لمبی اور ان کی تہبند نیچے تک لٹکتی نہ ہوتی!''

نتیجہ اس طرزِ تربیت کا حسبِ توقع یہ نکلا کہ آپ ﷺ کے یہ الفاظ حضرت خریمؓ تک پہنچے تو دل میں تیر بن کر اُتر گئے۔ انہوں نے ایک چھری اٹھائی اور اپنی لٹوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔

اسی طرح بخاری شریف کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا:

((نِعْمَ الرَّجُلُ عَبْدُ اللّٰهِ لَوْ كَانَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ)) (۱۲)

''عبداللہ خوب آدمی ہیں' کیا اچھا ہوتا کہ وہ رات میں نماز بھی پڑھا کرتے!''

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو جب رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد معلوم ہوا تو ذہن نے معاً فیصلہ کر لیا اور پھر وہ راتوں میں کم سونے لگے۔

آدمی جن خامیوں کا شکار ہوتا ہے اور جن کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ بنیادی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو کردار کی خامی' دوسرے اندازِ فکر کی خامی۔ کردار کی خامی کی

(۱۱) سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ما جاء فی اسبال الازار۔

(۱۲) صحیح البخاری، کتاب التهجد، باب فضل قیام اللیل، ح۱۱۲۲۔ وصحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عبد اللّٰه بن عمر رضی اللہ عنہما، ح ۲۴۷۹۔

اصلاح کے سلسلے میں حضور ﷺ کا انداز بالعموم ایسا ہی حکیمانہ اور مشفقانہ ہوا کرتا تھا۔ البتہ اندازِ فکر کی خامی آپ ﷺ کی نگاہ میں زیادہ قابل توجہ اور قابلِ گرفت قرار پاتی تھی۔ اس لیے اس کی اصلاح کے اندر حکمت کے ساتھ تنبیہہ اور قدرے زجر وتوبیخ کا عنصر بھی شامل ہوا کرتا تھا۔ وہ بالعموم ''مَا بَالُ أَقْوَامٍ'' کے لفظوں سے شروع ہوتا تھا۔ یعنی آپ ﷺ ایسے مواقع پر یوں فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا ایسا کرتے یا ایسا ایسا کہتے ہیں! گویا ایسے مواقع پر بھی آپ ﷺ فکری خامی کا مظاہرہ کرنے والوں کے نام لیے بغیر نصیحت اور تنبیہہ بالکل عمومی انداز میں فرمایا کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ اندازِ کلام آپ ﷺ اس مصلحت کی خاطر اختیار فرماتے کہ لوگوں میں کہیں ناگواری کا جذبہ نہ ابھر آئے اور اس طرح نصیحت وتنبیہہ کا مقصد ہی فوت ہو کر نہ رہ جائے۔

اصلاح وتربیت کے بارے میں ہمیں بھی اِسی اُسوہ کی پیروی کرنی چاہیے' کیونکہ اس اندازِ تربیت سے بہتر انداز دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰه ربّ العالمین○○

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس' سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ

ڈاکٹر ربیعہ ابرار

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات وہ حکمت بھری روشنیاں ہیں جو ہر دور کے انسان کے لیے زندگی کے تنگ و تاریک راستوں میں مشعلِ راہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی بعض احادیث عوام الناس میں، بعض علماء اور محدّثین میں اور بعض فقہاء میں خاص مقبولیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان معروف احادیث میں جو علماء، طلبہ اور عوام الناس میں یکساں معروف ہیں، رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان مبارک بھی ہے کہ ''بے شک اَعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے.....'' دین کا بنیادی علم رکھنے والا ہر شخص اس حدیث مبارکہ کو بارہا سن پڑھ چکا ہوتا ہے۔ اسی طرح عام لوگوں کو بھی کبھی اپنے دفاع میں تو کبھی کسی کو بطورِ تو بیخ یہ یاددہانی کرائی جاتی ہے کہ عمل کی جزا تو نیت کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ نیتوں کا حال خوب جانتا ہے۔

یوں تو رسول اللہ ﷺ کی ہر بات میں حکمت کے خزانے ہیں، لیکن یہ حدیث مبارکہ اپنے اندر انسانی زندگی کے بے شمار اَسرار سموئے ہوئے ہے۔ زندگی کے ہر ہمّ و غم سے نجات کا راز، انسانوں کے درجوں میں تفاوت کا سبب، چیزوں کے لافانی ہو جانے کی ترکیب، دورِ حاضر میں سب سے زیادہ تلاش کی جانے والی شے یعنی اطمینان اور سکون کو پانے کا طریقہ سبھی اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ تحریر اسی حدیثِ مبارکہ سے حکمت کے چند موتی اخذ کرنے کی عاجزانہ سعی ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا کہ مَیں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ فَهِجرَتُهُ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ اِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا اَوْ اِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا، فَهِجْرَتُهُ اِلَى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ))

''تمام اَعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر عمل کا نتیجہ ہر انسان کو اس کی نیت کے مطابق ہی ملے گا۔ پس جس کی ہجرت (ترکِ وطن) اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی طرف ہو تو اُس کی ہجرت (اللہ کے نزدیک) اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی طرف ہی شمار ہوگی، اور جس شخص کی ہجرت دولتِ دنیا حاصل کرنے کے لیے ہو یا کسی عورت سے شادی کی غرض سے ہو، پس اُس کی ہجرت ان ہی چیزوں کے لیے شمار ہوگی جن کے حاصل کرنے کی نیت سے اس نے ہجرت کی ہے۔''

تعارف

اس حدیث کے موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے عموماً دینی کتب اور خصوصاً کتبِ حدیث کے آغاز میں لایا جاتا ہے۔ امام نوویؒ اپنی ''اربعین'' کے آغاز میں اور امام بخاریؒ اپنی شہرۂ آفاق ''الجامع المسند الصحيح المختصر من أمور رسول الله ﷺ وسننه وأيامه'' (صحيح البخاری) میں بطورِ مقدمہ اسی حدیث کو لائے ہیں۔ یہی حدیث صحیح بخاری میں ۶ دیگر مقامات پر بھی وارد ہوئی ہے (ح: ۵۴، ۲۵۲۹، ۳۸۹۸، ۵۰۷۰، ۶۶۸۹)۔ امام مسلم اس حدیث کو صحیح مسلم میں کتاب الامارہ (ح: ۴۹۲۷) میں لائے ہیں۔ صحاحِ ستّہ کی دیگر کتب میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ مختلف روایات میں الفاظ کی معمولی کمی بیشی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ حدیث کے موضوع پر اگر سو کتابیں لکھی جائیں گی تو یہ حدیث ان سب کتابوں کے مقدمے میں لائی جائے گی۔ امام احمدؒ کہتے ہیں کہ اسلام کے اصول تین حدیثوں پر مبنی ہیں: پہلی حدیث عمر رضی اللہ عنہ (زیرِ موضوع حدیث)، دوسری حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا (صحیح مسلم: ۴۴۹۳) اور تیسری نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث (صحیح بخاری: ۵۲)۔

راوی کی نسبت سے یہ حدیث، حدیثِ عمرؓ کہلاتی ہے اور روایت کے اعتبار سے یہ غریب مطلق ہے۔ یعنی دورِ صحابہؓ میں سے اسے حضور اکرم ﷺ سے روایت کرنے والے صحابی صرف ایک ہی ہیں۔ البتہ یہ غرابت اس حدیث کو کمزور کرنے والی نہیں ہے، کیونکہ اس کے راوی فاروقِ اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں جن کی حدیث کے معاملے میں احتیاط ایک معروف بات ہے۔ مزید یہ کہ اس حدیث مبارکہ کو انہوں نے اپنے دورِ خلافت میں کئی صحابہؓ کی موجودگی میں منبر سے بیان فرمایا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے اس پر کوئی کلام نہیں کیا۔

الفاظ کی وضاحت

اِنَّمَا کلمۂ حصر ہے‘ یہ اِنَّ (بمعنی بے شک) اور مَا نافیہ (بمعنی نہیں) کا مجموعہ ہے‘ جس کا معنی بنتا ہے: ’’سوائے اس کے نہیں‘‘ جیسا کہ کلمہ حصر مذکورہ شے پر حکم صادر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے تو گویا اِنَّمَا جس کلمے کے ساتھ استعمال ہوگا‘ اس کے علاوہ باقی سب کی نفی کر دے گا۔

الْاَعْمَال میں عموماً عادات اور خصوصاً عبادات شامل ہیں۔ ان میں سوچ اور ارادہ جو کہ دل کے اعمال ہیں‘ قول جو زبان کا عمل ہے‘ اور باقی سب افعال عبادات و معاملات جو بدن کے اعمال ہیں‘ سب کے سب شامل ہیں۔

نِیّات نیت کی جمع ہے جو نوٰی سے ہے۔ نوٰی کے معنی گٹھلی کے ہیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ﴾ (الانعام:۹۵) ’’بے شک اللہ دانے اور گٹھلی کا پھاڑنے والا ہے۔‘‘ اصطلاح میں اس کا معنی عزم القلب علی امر من الامور ہے‘ یعنی دل کا کسی کام کو کرنے کا قصد کرنا۔

ھَجَرَ کے معنی ترک کرنے کے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ)) (صحیح البخاری، کتاب الایمان، ح:۱۰) ’’اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کردہ چیزوں کو چھوڑ دے۔‘‘ اصطلاحی معنی میں یہ خروج من الارض الی الارض ہے‘ اور اسلام میں ہجرت دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف چلے جانا ہے۔

تفکّر و تدبّر

اس حدیث مبارکہ کا ابتدائی حصّہ اس کا مغز (crux) ہے‘ یعنی تمام اعمال کا دار و مدار کُلّی طور پر نیت پر ہے اور نیت کے سوا کسی دوسری چیز پر نہیں۔ بظاہر کوئی بہت بڑا نیکی کا کام ہی کیوں نہ ہو‘ لوگوں میں نہایت مقبول اور دیکھنے سننے میں بہت خوبصورت ہو‘ اس کے فائدے بھی بے شمار ہوں‘ لیکن اللہ کے ہاں اس کا معاملہ منحصر ہے اس عمل کی محرک نیت پر جو کہ عامل کے دل میں مخفی ہے۔ دل کے معاملات وہ ہیں جنہیں ربّ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کہا جاتا ہے کہ ببول بو کر گلاب نہیں کاٹے جا سکتے‘ یا یہ کہ جو بوئیں گے‘ وہی کاٹیں گے۔ جزا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ وہ اپنی نیت کی کھیتی ہے۔ پہاڑ جیسا عمل اس ایک نظر نہ آنے والی نیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں یا مقبول ہو سکتا ہے یا مردود۔ گٹھلی پھل میں کہیں چھپی ہوتی ہے لیکن سارا کا سارا درخت اسی میں

چھپا ہوتا ہے۔ اس درخت سے ملنے والے تمام فوائد یعنی اس کا سایہ‘ اس کی لکڑی‘ اس کا حسین سبزہ‘ اس کے مہکتے پھول‘ اس کا میٹھا پھل‘ سب کچھ اس ایک بیج میں پنہاں ہے۔

یہی معاملہ نیت اور عمل کا بھی ہے‘ یعنی کوئی چھوٹی سی نیکی بھی اگر خلوصِ نیت سے کی گئی ہو تو ربّ تعالیٰ اُسے اپنے دائیں ہاتھ سے قبول فرماتے ہیں اور لقمہ کو پہاڑ جتنا کر دیتے ہیں (مسندِ احمد: ۷۶۲۲)۔ وہ ربِّ رحیم تو اس حد تک قدر دان ہے کہ خالص نیت سے رکھے جانے والے روزے کو نہ صرف بیش بہا اجر سے نوازتا ہے بلکہ روزے دار کے منہ کی بو کو مشک و عنبر سے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔ (صحیح بخاری: ۷۴۹۲)۔ تہجد کی نیت کر کے سونے والا اگر قیام کے لیے نہ اُٹھ پائے تو بھی اپنا پورا اجر پا لیتا ہے‘ صرف اپنی نیت کی بدولت۔ اس کے برعکس بُری نیت اس بے کار بیج کی طرح ہے جس کا پودا نہ پھل لائے‘ نہ سایہ دے اور نہ ہی مالی کا دل خوش کرے۔ جس طرح بیج اپنے لیے پوری خدمت کا تقاضا کرتا ہے یعنی آبیاری‘ زرخیز زمین‘ موافق موسم‘ پرندوں اور کیڑے مکوڑوں سے حفاظت‘ اسی طرح نیت کے معاملے میں بھی صرف یہی کافی نہیں کہ کسی شرک کا ارادہ نہ ہو بلکہ اس عمل کا خالص اللہ کے لیے ہونا بھی ضروری ہے۔ حدیثِ قدسی ہے:

((قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ)) (صحیح مسلم:۷۴۷۵)

’’اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ شریک بنائے جانے والوں میں سب سے زیادہ مَیں شراکت سے مستغنی ہوں۔ جس شخص نے بھی کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کیا تو مَیں اُسے اس کے شرک کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیتا ہوں۔‘‘

وہ ربّ ذوالجلال تمام جہانوں کا اکیلا مالک ہے اور ہر طرح کی شراکت سے مستغنی ہے۔ کوئی ایسا کام جو اُس کے نام سے کیا جائے مگر اس میں اُس کی رضا کے علاوہ کسی اور کی بھی نظرِ کرم کی چاہت کو ملحوظ رکھا جائے تو وہ کام اُس کے حضور کیسے شرفِ قبول حاصل کر سکتا ہے! عبادات کے سلسلے میں تو یہ معاملہ اور بھی سنگین ہے کہ ذرا سی ریاکاری کو بھی شرکِ خفی کہا گیا ہے۔ نبی آخر الزماں ﷺ نے اپنی اُمّت کے لیے اسے دجّال کے فتنے سے بھی زیادہ محسوس فرمایا۔

عظیم سے عظیم عمل جان توڑ کوشش سے کر رہے ہیں‘ لیکن اگر اس میں شرک یا ریا کی ملاوٹ کر دی جائے تو ثواب تو دور ایسا عمل وبالِ جان ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ

کی ایک حدیث روایت کرتے ہوئے بار بار بے ہوش ہو جاتے (سنن الترمذی: ۲۳۸۲)۔ حدیث تھی ہی ایسی جھنجوڑ دینے والی۔ روزِ قیامت حساب کتاب کی ابتدا جن لوگوں سے کی جائے گی‘ وہ ایسے تین اعمال کرنے والے ہوں گے جو چوٹی کے بہترین اعمال ہیں۔ میدانِ جنگ میں شجاعت دکھاتے ہوئے شہید ہونے والا مجاہد‘ قاریٔ قرآن جو رات دن کتاب اللہ کی تلاوت کیا کرتا تھا اور وہ مال دار سخی جو ہر اُس راستے میں خرچ کیا کرتا تھا جو اللہ کی رضا کا تھا۔ جب فیصلہ سنایا جائے گا تو وہ اُن کے حق میں نہ ہوگا بلکہ انہیں منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ یہی وہ پہلے تین اشخاص ہوں گے جن سے قیامت کے دن جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی۔ اس کی وجہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی کہ اُن کا عمل اللہ کے لیے نہ تھا بلکہ لوگوں میں مقبولیت اور ناموری حاصل کرنے کے لیے تھا۔ (صحیح مسلم: ۱۹۰۵)

اسی طرح زیرِ موضوع حدیث میں ہجرت کے بارے میں نیت کی درستگی کا ذکر آتا ہے کہ کسی شخص کی ہجرت اُسی چیز کے لیے شمار ہوگی جو اُس کی نیت میں ہے۔ ہجرت جیسا عظیم عمل سابقہ گناہوں کا کفّارہ بن جانے والا ہے۔ ایک موقع پر نبی اکرم ﷺ نے اَنصار سے اپنی محبّت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ((لَوْلَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَأً مِنَ الْأَنْصَارِ)) (صحیح البخاری: ۳۷۷۹) ’’اگر ہجرت نہ ہوتی تو مَیں بھی انصار کا ایک فرد ہوتا۔‘‘ یہاں بھی ہجرت کے ثواب کو مقدّم رکھا‘ لیکن وہ بھی اکارت ہے اگر نیت دنیا میں سے کسی شے کی طلب ہے۔ یہ بڑے بڑے اعمال یعنی جہاد‘ ہجرت‘ قرآن کا پڑھنا پڑھانا‘ راہِ خدا میں خرچ کرنا سب اپنے کرنے والے کی نیت کے تابع ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خزانے بہت وسیع ہیں۔ اُس کی رضا کے لیے کیے گئے ایک عمل کا ثواب ۱۰ سے ۷۰۰ گنا تک ہے بلکہ بعض اعمال کا اجر انسانی فہم سے ماوراء ہے‘ جیسے صبر کا اجر اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھوں سے لپ بھر بھر کر عطا فرمائیں گے‘ اسی طرح روزے کے اجر کا معاملہ ہے۔ دوسری طرف دنیا کے طالب کے لیے دنیا اسی قدر ہے جتنی اس کے نصیب میں پہلے سے لکھ دی گئی ہے۔

یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بندۂ مؤمن کے لیے دنیا میں کوئی حصّہ نہیں؟ بات وہی نیت کی ہے۔ اچھی نیت کے ساتھ عادت بھی عبادت ہے جبکہ بعض لوگوں کی عبادات بھی عادت ہیں۔ مثلاً بعض لوگ نماز اس لیے پڑھتے ہیں کہ عادت ہے‘ نہ پڑھے بغیر چین نہیں آتا‘ یا بعض

خواتین پردے کا اہتمام صرف اس لیے کرتی ہیں کہ ان کے خاندان میں پردہ کیا جاتا ہے۔ یعنی عبادت کے کاموں کو عادتاً کر لیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بعض لوگ چائے بھی اسی لیے پیتے ہیں کہ علم دین پڑھنے پڑھانے کے لیے تازگی حاصل کر سکیں‘ یا ورزش اس لیے کرتے ہیں کہ ازروئے فرمانِ نبویؐ: ((الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ)) (صحیح مسلم: ۶۷۷۴) ’’قوی مؤمن کمزور مؤمن کی نسبت اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہتر اور زیادہ محبوب ہے۔‘‘ یعنی دنیاوی کاموں کو عبادت بنا لیا۔ گویا روزمرّہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی نیت کی مستقل جانچ پڑتال کی ضرورت رہتی ہے۔ سیرتِ مطہرہ سے بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ اس طرح حکیمانہ انداز میں نبی ﷺ اپنے اہل کی توجہ نیتوں کی درستگی کی طرف دلواتے رہتے تھے۔ ایک موقع پر جب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی مسجدِ نبوی میں اعتکاف کے لیے خیمے لگا لیے تو نبی مکرم ﷺ نے خود اپنا اعتکاف بھی ترک فرما دیا‘ کیونکہ ازواجِ مطہراتؓ میں یہ مسابقت اللہ کی رضا کے بجائے رقابت کی طرف مائل نظر آتی تھی۔

قرآن کریم جو ذکرِ عظیم ہے اور انسان کو ضروری چیزوں کی یاددہانی کرواتا رہتا ہے‘ وہ نیتوں کی درستگی کا بھی بار ہا ذکر کرتا ہے۔ سُنّتِ ابراہیمی کی یادگار عیدِ قربان جو اللہ کی راہ میں اپنی سے اچھا عزیز ترین چیز کو قربان کر دینے کا سبق ہے‘ اس موقع پر ہر شخص اپنی حیثیت سے بڑھ کر اچھے سے اچھا جانور اللہ کی راہ میں قربان کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ اُس تک نہ ان جانوروں کے گوشت پہنچتے ہیں نہ خون بلکہ جو تم سے درکار ہے وہ تقویٰ ہے۔ (الحج: ۳۷)

اسی طرح صدقات کے معاملے میں دو مثالوں سے سمجھایا گیا کہ اللہ کی رضا کی خاطر صدقات کی مثال اونچی جگہ پر واقع باغ جیسی ہے جس پر جب بارش برستی ہے تو دوگنا پھل لاتا ہے‘ اور اگر بارش نہ بھی میسر ہو تو شبنم کی معمولی نمی بھی کافی ہے کہ مالک کو اپنے پھل سے آسودہ رکھے (البقرۃ: ۲۶۵)۔ یعنی نیک نیتی کے ساتھ تھوڑا صدقہ بھی کافی ہے‘ جیسے کہ غزوۂ تبوک میں ایک صحابیٔ رسول کی پیش کردہ مُٹھی بھر کھجوروں کی مثال ہمارے لیے رہنما ہے۔ دوسری طرف مثال دی گئی ایک کھجور اور انگور کے باغ کی کہ جس میں اور طرح کے پھل بھی آتے ہوں‘ نہریں بہتی ہوں‘ لیکن وہ ایسے وقت آفت کا شکار ہو جائے جبکہ مالک خود بڑھاپے کو پہنچ چکا ہو اور اس کی

اولاد ابھی ناتواں ہو۔ یعنی اصل تو برباد ہوا ہی‘ نیا پھل اُگانے کی بھی اب سکت باقی نہیں۔ یہ مثال بعض اوقات ہم دنیا میں اس طرح دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے فلاحی اور خیراتی اداروں کو چلانے والے یا تو مسلمان نہیں ہوتے یا ان کا مطلوب و مقصود اللہ کی رضا نہیں ہوتی۔ چنانچہ دنیا میں تو ان کے بھلائی کے کام خلقِ خدا کے لیے مفید اور خود ان کے لیے نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں لیکن روزِ قیامت جب ایسے شخص کو میدانِ حشر کی تپتی دھوپ میں اپنے صدقات کے سائے کی ضرورت ہوگی تب اسے معلوم ہوگا کہ دنیا میں لگایا ہوا اس کا باغ یہاں اُس کے کسی کام کا نہیں۔ مزید یہ کہ عمل کا دروازہ بھی بند ہو چکا ہوگا‘ لہٰذا ایسے میں وہ بالکل ہی خالی ہاتھ رہ جائے گا۔

نیت کا معاملہ صرف انفاقِ مال تک ہی محدود نہیں۔ بندۂ مؤمن کے لیے مال جمع کرنا بھی درست ہے (شکر اور حقوق کی ادائیگی کے ساتھ)۔ مثال دیکھیے اللہ کے صابر نبی حضرت ایوب علیہ السلام کی۔ ایسے حال میں جب اللہ تعالیٰ اُن کی آزمائش کے بعد ان کو پھر سے بہت نواز چکے ہیں تب بھی وہ اپنے اوپر گرنے والی سونے کی ٹڈیاں سمیٹنے لگتے ہیں۔ یہ اُن کی مال کے لیے حرص نہیں بلکہ نیت یہ ہے کہ اپنے رب کی طرف سے آنے والی برکت کو سمیٹ رہے ہیں۔ (صحیح بخاری: ۲۷۹)

پھر مثال لیجیے حضرت سلیمان علیہ السلام کی‘ اللہ کے نبی بھی ہیں‘ بے مثل بادشاہ بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی عطا کی کوئی حد نہ رکھی تھی لیکن مزید کا سوال کر لیا‘ ایسی بادشاہت مانگ لی جو اُن کے بعد کسی کو سزاوار نہ ہو۔ یہ دنیا کی طلب نہ تھی بلکہ اس لیے تھا کہ وہ جانتے تھے ان کی سب سے بڑی خوبی اور صلاحیت عادلانہ بادشاہت ہے۔ انہیں ادراک تھا کہ وہ اللہ کی زمین پر اُس کا دین اپنی بادشاہت کے ذریعے غالب کر کے اللہ کے دین کی بہترین خدمت کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُن کو اُس زمانے کا بہترین مال یعنی عمدہ اصیل گھوڑے پیش کیے گئے تو فرمانے لگے کہ میں نے اِس مال کو اپنے ربّ کی یاد کے لیے محبوب رکھا ہے۔ یہی نیتوں کا فرق ہے جو مال کو خیر اور شر بناتا ہے۔

اسی ضمن میں صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ گھوڑے تین طرح کے ہیں: خیر‘ شر اور ستر۔ جو اللہ کی راہ میں ہو وہ خیر ہے‘ جو ریاکاری اور مسلمانوں کی عداوت کے لیے ہو وہ شر ہے‘ اور جو انسان کی اپنی ذاتی ضروریات کے لیے ہو وہ ستر ہے۔ یعنی ایک ہی شے ہے‘ ایک چوپایا‘ لیکن اُس کے مالک کی نیت اسے تین مختلف صورتوں میں لے آتی ہے۔ پھر جس پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی

نیت ہے اُس کا کھانا‘ پینا‘ اُچھلنا حتیٰ کہ فضلے کا اخراج بھی مالک کے نامۂ اعمال میں نیکی کے طور پر لکھا جائے گا۔

اخلاصِ نیت کے فوائد

اس حدیثِ مبارکہ کو اساسی اہمیت حاصل ہونے کی وجہ دوہری ہے۔ ایک یہ کہ یہ ہر انسان سے متعلق ہے اور دوسری یہ کہ یہ اس کی روزمرہ زندگی سے متعلق ہے۔ ہر انسان روزانہ ہر وقت کسی نہ کسی عمل میں ہے‘ جس کے پیچھے کوئی نہ کوئی نیت ہوتی ہے۔ اگر نیت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لیا جائے تو وہ اس کے لیے کئی فوائد لا سکتی ہے۔ چند ایک پر غور کرتے ہیں:

(i) **تعریف و تنقید سے بے نیازی:** انسان جب کسی کام کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو کر کرتا ہے تو اس کے لیے یہ سوال بے معنی ہو جاتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے! یہ چیز اسے خود اعتمادی بھی دیتی ہے اور وہ بے فکر ہو کر کام کرتا چلا جاتا ہے۔ ع ”نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا!“ نہ وہ لوگوں کی تحسین کا منتظر رہتا ہے کہ پزیرائی ملے تو وہ آگے بڑھے‘ اور نہ ہی کسی کی بے جا تنقید پر بددل ہو کر کام چھوڑ بیٹھتا ہے۔

(ii) **اعمال میں خوبصورتی:** بندہ مؤمن جب کسی کام کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خالص ہو کر کرتا ہے تو اسے یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ میرا یہ کام اللہ کی نظر میں ہے‘ چنانچہ اس کام میں خود بخود خوب صورتی پیدا ہو جائے گی۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب صدقہ دیا کرتے تھے تو اس پر خوشبو لگا کر دیا کرتے تھے‘ کیونکہ وہ اسے کسی حاجت مند کے ہاتھ پر نہیں رکھتے تھے بلکہ اللہ کے حضور پیش کیا کرتے تھے۔ مزید یہ کہ ایسے کام میں ہونے والی تھکاوٹ بامعنی ہو جاتی ہے۔

(iii) **ڈپریشن سے نجات:** اللہ کی خاطر بھلائی کرنے والے کسی قسم کے بدلے کی آس سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہ غم کہ ہم کسی رشتے دار کے لیے کتنے پیار سے اتنا کچھ کر رہے ہیں اور بدلے میں وہ ہمارے لیے اچھا رویہ تک نہیں رکھتے‘ اسی طرح کے اور غم جو انسان کو ڈپریشن اور مایوسی کی طرف لے جاتے ہیں‘ انسان ان سے نجات پا جاتا ہے۔

(iv) **تقویٰ کا حصول:** وہ انسان جو بار بار اپنی نیت کا جائزہ لیتا رہتا ہے‘ اسے درست کرتا رہتا ہے‘ اپنی توجّہ اللہ اور آخرت کے معاملات کی طرف رکھتا ہے تو گویا وہ متقی ہو جاتا ہے۔ تقویٰ کی روح یہی ہے کہ انسان کا دل اللہ کی طرف متوجّہ رہے۔ قرآن کریم کی رو سے جسے تقویٰ

حاصل ہو گیا‘ یقیناً وہ ہدایت پا گیا اور فلاح پانے والوں میں سے ہو گیا۔

(۷) برکت کا حصول: یہ بات مصمم ٹھہری کہ ساری کائنات کو فنا ہے سوائے ربّ ذُوالجلال کی ذات کے۔ لہٰذا جو کام اُس کی خاطر کیے جاتے ہیں‘ دوام بھی انہی کو نصیب ہوتا ہے۔ خیر کے وہ کام جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے والے ہوتے ہیں‘ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں قرار بخشتے ہیں۔ ان کاموں میں سے بھی سب سے زیادہ برکت والے وہی ہوتے ہیں جو اللہ کی رضا کی خاطر اُسی کے نام پر کیے جاتے ہیں۔ زندگی میں آنے والی کئی پریشانیاں‘ کتنی ہی رکاوٹیں‘ کیسے کیسے پتھر اللہ کی رضا کے لیے کیے گئے کاموں کے توسّط سے ہٹ جاتے ہیں۔ غار میں پھنسنے والے تین اشخاص کا واقعہ ایک مثال ہے کہ جب یقینی موت کا پیغام لے کر آنے والا پتھر بھی اُن اعمال کے واسطے کی دعاؤں سے ہٹ گیا تھا جو خالص اللہ کی خاطر کیے گئے تھے۔ (صحیح بخاری ۲۲۱۵)

برکت کے ثمرے کی ایک حسین مثال

خلوصِ نیت سے کیے گئے کام میں کس طرح برکت ہوتی ہے اور اس کے اثرات اللہ عزّوجل کس طرح برقرار رکھتے ہیں‘ اس کی ایک مثال حضرت حنّا زوجہ عمران کے واقعے میں ہے۔ وہ اپنے سب سے عزیز اثاثے یعنی اپنی آنے والی اولاد کو خالص اللہ کے لیے وقف کر دیتی ہیں۔ خلافِ توقع ان کے ہاں بیٹی (مریمؑ) ہوتی ہے‘ مگر وہ اللہ سے اپنے کیے گئے عہد کو پورا کرتی ہیں۔ وہ ربّ جو نیتوں کا سب سے بہتر جاننے والا ہے‘ وہ ان کے خلوص کو قبول فرماتا ہے۔ ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ وقت کے نبی حضرت زکریا علیہ السلام کو مریم (سلام علیہا) کا کفیل بنا دیا جاتا ہے۔ حضرت مریمؑ کے پاس بند کمرے میں بے موسم پھل دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام کو ایک نئی امید نصیب ہوتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے حصولِ اولاد کی دعا کرتے ہیں اور انہیں حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسا فرزند عطا ہو جاتا ہے۔ نہ صرف حضرت یحییٰ علیہ السلام نبوت سے سرفراز ہوتے ہیں‘ بلکہ خود مریم سلام علیہا کو اللہ تعالیٰ معجزانہ طور پر جو بیٹا عطا کرتے ہیں وہ بھی نبی ہے۔ ان انبیاء کی اپنی نیکیاں‘ دعوت اور تبلیغ‘ پھر ان کے مخلص ساتھیوں کی نیکیاں‘ پھر جس طرح ایک عرصے تک عیسائی حق پر رہے اور سچے دین کو مانتے رہے‘ اس ساری خیر کا تصور کرتے جائیں۔

اگرچہ آج عیسائیت عقائد کے اعتبار سے درست راہ سے پھر گئی ہے‘ لیکن خیر کے کئی کام ان کے کھاتے میں رہے ہیں۔ مزید اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے پاس سے ان کے دل میں شفقت اور

رحم رکھنے کا ذکر قرآن میں فرمایا ہے: ﴿وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً﴾ (الحدید: ۲۷) آج بھی عیسائیت کے نام پر فلاح کے کچھ نہ کچھ کام جاری ہیں۔ قریبِ قیامت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول‘ ان کے ہاتھوں دجال کا خاتمہ‘ یہودیوں کا قلع قمع اور دنیا بھر میں عادلانہ اسلامی حکومت کا نفاذ‘ اس ساری خیر و برکت کو پیچھے کی طرف ٹریس کرتے چلے جائیں‘ تو اس کی بنیاد میں نہ نظر آنے والا بیج‘ جس کا عموماً ذکر بھی نہیں کیا جاتا‘ وہ اُس ایک عورت کی خالص اللہ تعالیٰ کے لیے مانی گئی نذر تھی۔ حضرت حنّا بس نیکی کا ایک کام کرنا چاہتی تھیں‘ ایک نذر پوری کرنا چاہتی تھیں‘ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اس کے آثار اور اثرات کو قیامت تک کے لیے باقی کر دیا۔

سب سے اعلیٰ نیت

نیتوں میں سب سے اعلیٰ نیت کیا ہے؟ ثواب کی نیت‘ جنت کا حصول‘ لوگوں کی بھلائی! یہ نیتیں بھی اچھی ہیں لیکن حدیث مبارکہ سے رہنمائی ملتی ہے کہ اہلِ جنّت کے لیے سب سے بڑی نعمت ربّ تعالیٰ کا دیدار ہوگا (صحیح مسلم: ۴۴۹)۔ قرآن کریم میں بھی اسے کامیابی کی علامت قرار دیا گیا ہے (الروم: ۳۸)۔ اپنے تمام اَعمال خصوصاً عبادات میں ہماری نیت اللہ کا چہرہ چاہنے کی ہونی چاہیے۔ وہ کون سے اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ کے دیدار کے لیے کیے جا سکتے ہیں؟ فجر اور عصر کی نماز کی پابندی (صحیح بخاری: ۵۷۳)‘ اللہ کی خاطر صدقہ کرنا (الروم: ۳۹)‘ کھانا کھلانا‘ صبر اور نماز (الرعد: ۲۲) صبح و شام اللہ کو پکارنا۔ خصوصاً تہجد کی نماز (الانعام: ۶)

عملی نکات

یوں تو زندگی کے ہر معاملے میں ہی نیت کی درستگی ضروری ہے‘ لیکن انسان خطا و نسیان کا پُتلا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک دو پہلوؤں پر خصوصی توجّہ کر کے اپنی نیت کی درستگی کے سفر کا آغاز کر سکتا ہے۔ پہلا اپنی عبادات کی طرف توجّہ دینا۔ سوچیں کہ کیا میں اپنی نماز‘ روزہ اور دیگر عبادات کو عادتاً کر رہا ہوں یا اس کی اصل روح بھی میرے ذہن میں ہے!

دوسرا‘ ہر شخص یہ جائزہ لے سکتا ہے کہ میری زندگی میں سب سے اہم کام یا غالب مصروفیت کیا ہے! عام قسم کی مصروفیات تین ہیں‘ جن کا مختصر جائزہ لیتے ہیں:

- طلبہ سوچیں کہ ان کے طلبِ علم کا مقصد کیا ہے! کیا صرف دنیا حاصل کرنا؟ یاد رکھیں کہ

قرآن کا طالب ہونا اتنا بڑا اشرف ہے کہ مچھلیاں اور چیونٹیاں تک طالب علم کے لیے دعا کرتی ہیں۔ اگر نیت ریاکاری ہو یا لوگوں سے بحث کرنا ہو‘ اپنی شان جتانا ہو تو یہ خراب نیت جہنم تک لے جانے والی ہے۔

- وہ لوگ جو ملازمت یا کاروبار کرتے ہیں خصوصاً مرد حضرات‘ وہ اس دنیاوی کام کو بھی آخرت کے لیے اس طرح ذخیرہ بنا سکتے ہیں کہ حلال رزق کمانا بھی عبادت ہے۔ کفالت میں آنے والوں کی ضروریات اور تربیت ان پر فرض ہے اور فرض کو احسن انداز سے پورا کرنا نفل عبادت سے بڑھ کر ہے۔
- خواتین کا واسطہ عموماً امور خانہ داری اور کھانا پکانے‘ کھلانے سے رہتا ہے۔ اسے بوجھ سمجھنے کے بجائے سعادت بھی بنایا جا سکتا ہے۔ کھانا کھلانا ہمارے دین کا حصّہ ہے۔ کتنی عظیم ہے اُمّت کی وہ عورت جو نہ تو کسی کی تعریف کے لیے اور نہ ہی روزمرہ کی ذمہ داری سمجھ کر کھانا پکاتی ہے بلکہ اس کی نیت اللہ کا چہرہ چاہنے کی ہوتی ہے۔ وہ اس کا صلہ اللہ سے چاہتی ہے اور اسے کسی کا شکریہ تک درکار نہیں ہوتا (الدھر:۹)۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ پہلے عورت بچے کو دودھ پلاتی تھی کہ وہ اسلام کے لیے جہاد کرے گا تو اُمّت میں مجاہد پیدا ہوتے تھے‘ آج مائیں دودھ پلاتی ہیں کہ بچہ سو جائے‘ تو نتیجہ یہ ہے کہ اُمّت سو رہی ہے۔ عورت کا کردار اُمّت میں معمار کا ہے اگر اس کی نیت درست ہو۔

خلاصہ کلام یہی ہے کہ زندگی درست ہو سکتی ہے اگر نیت درست ہو تو۔ حدیثِ عمرؓ کے اس جائزے کا اختتام ہم دعائے عمرؓ ہی سے کرتے ہیں اور آپؐ ہی کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے نیتوں کی درستگی کا سوال کرتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ عَمَلِي كُلَّهُ صَالِحًا، وَاجْعَلْهُ لِوَجْهِكَ خَالِصًا، وَلَا تَجْعَلْ لِأَحَدٍ فِيهِ شَيْئًا

’’اے اللہ! میرے تمام عمل کو صالح کر دے اور اس کو اپنے چہرے کے لیے خالص کر لے اور اس میں کسی ایک کا بھی حصّہ نہ رکھ۔‘‘

❁❁❁

اسماء اللہ الحُسنیٰ (۵)

از: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

(۳۲) اَلْمُقِیْتُ

اسم اَلْمُقِیْتُ کے معنی سب کو روزی دینے والے اور عطائے قوت میں توانائی رکھنے والے کے ہیں۔ یعنی وہ ذاتِ اقدس جو اپنی تمام جاندار مخلوق کے لیے غذا پیدا کرے اور ان کو مہیا کرے‘ خواہ جسم کے لیے ہو جیسے کہ مختلف النوع اسبابِ رزق وغیرہ‘ اور خواہ روح کے لیے ہو‘ جیسے تقویٰ‘ علم‘ اخلاق وغیرہ۔ بعض نے اس کا مطلب قدرت اور قابو پانے والا بھی لیا ہے۔ مُقِیت‘ قُوت سے بھی ہے‘ جو غذا کی اس مقدار کو کہتے ہیں جو جزوِ بدن ہو سکے اور قوت و صحت کے قیام کا ذریعہ بن سکے۔ سورۃ النساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا ﴿۸۵﴾﴾ ’’اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر قوت رکھنے والا ہے۔‘‘

(۳۳) اَلْحَسِیْبُ

لفظ حَسِیْب کا معنی ہے سرداری اور شرف و کمال والا‘ یعنی وہ مقدّس ہستی جو سب مخلوقات و موجودات کی سردار اور ان سب سے اشرف و اکمل ہے۔ حَسِیْب کے معنی کفایت کرنے والے کے بھی ہیں‘ یعنی اللہ تعالیٰ ہی اپنی ساری مخلوق کو وہ تمام چیزیں عطا فرماتے ہیں جو انہیں ان کی زندگی میں اور ان کی ضروریات میں کفایت کر سکیں۔ اسی ضمن میں محاورہ ہے: هٰذَا حَسْبُکَ مِنْ غَیْرِهٖ (یہ تجھے غیر سے کفایت کر جائے گا)۔ بعض حَسِیْب کو حساب کرنے والے اور حساب فہمی کرنے والے کے معنوں میں بھی لیتے ہیں۔ قرآن مجید میں لفظ ’’حَسِیْب‘‘ تین جگہ استعمال ہوا ہے اور اسی سے ’الحسیب‘ کا اسم تخریج کیا گیا ہے۔ سورۃ النساء میں آتا ہے: ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ﴿۶﴾﴾ ’’اور اللہ کافی ہے حساب لینے کے لیے۔‘‘ یہی الفاظ سورۃ الاحزاب (آیت ۳۹) میں بھی آئے ہیں۔ مزید ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿۸۶﴾﴾ (النساء) ’’یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔‘‘ اللہ تعالیٰ حسیب

ہے‘ اس کی حفاظت اور پناہ کافی ہے۔ سورۃ الطلاق کی آیت ۳ میں فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ﴾ ’’اور جو کوئی اللہ پر توکّل کرتا ہے تو اُس کے لیے وہ کافی ہے۔‘‘ سورۃ التوبۃ میں فرمایا: ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۫ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾﴾ ’’پھر بھی اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ میرے لیے اللہ کافی ہے‘ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ اُسی پر میں نے توکّل کیا اور وہ بہت بڑے عرش کا مالک ہے۔‘‘ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾﴾ ’’اور انہوں نے کہا: اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔‘‘

حَسِیب کے معنی حساب کنندہ کے بھی ہیں۔ حَسَبَ (ن) کا معنی ہے شمار کرنا۔ حُسْبَانٌ اس سے مصدر ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں فرمایا: ﴿اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ﴿۵﴾﴾ ’’سورج اور چاند (مقررہ) حساب سے ہیں۔‘‘ بروزِ قیامت ارشادِ ربانی ہوگا: ﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾﴾ (بنی اسرائیل) ’’پڑھ لو اپنا اعمال نامہ! آج تم خود ہی اپنا حساب کر لینے کے لیے کافی ہو‘‘۔ سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی کسی نماز میں یہ دعا کرتے ہوئے سنا: ((اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَّسِيْرًا)) ’’اے اللہ میرا حساب آسان لینا!‘‘ (مسند احمد)

(۳۴) اَلْكَرِيْمُ

خدائے بزرگ و برتر‘ الکریم‘ وہ ذات ہے جو بغیر سوال اور طلب کے اپنے بندوں کو ہر چیز عطا فرماتا ہے۔ ان بندوں میں اُس کے شکر گزار بندوں کے علاوہ وہ بندے بھی شامل ہیں جو یا تو اس کو قطعی نہیں مانتے یا پھر اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اس لیے بعض حضرات نے الکریم کے معنی درگزر کرنے والا بھی کیے ہیں۔ یہ اسم کرم سے ہے جس کے معنوں میں عظمت‘ شرف‘ عزت اور جود و سخاوت شامل ہیں۔ اہلِ زبان کہتے ہیں کہ کریم وہ ہے کہ وعدہ کرے تو پورا کرے‘ قدرت رکھتے ہوئے قصور معاف کر دے‘ عیب دیکھے اور پردہ پوشی کرے‘ قصور اور خطا کا پتہ ہو اور درگزر فرمائے۔

سورۃ الانفطار میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ﴿۶﴾﴾ ’’اے انسان! تجھے کس چیز نے دھوکے میں ڈال دیا ہے اپنے ربّ کریم کے بارے میں۔‘‘

سورۃ النمل میں فرمایا: ﴿وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾﴾ ’’اور جو کوئی شکر کرتا ہے تو وہ اپنے ہی (بھلے کے) لیے کرتا ہے۔ اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو میرا رب یقیناً بے نیاز ہے‘ بہت کرم کرنے والا۔‘‘ اللہ تعالیٰ کریم ہے کیونکہ وہ رسولِ کریم کو بھیجنے والا ہے۔ سورۃ الدخان میں فرمایا: ﴿وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾﴾ ’’اور ان کے پاس ایک بہت معزز رسول آیا تھا۔‘‘ اللہ تعالیٰ کریم ہے کیونکہ وہ قرآن کریم کا اتارنے والا ہے۔ سورۃ الواقعۃ میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾﴾ ’’یقیناً یہ بہت عزّت والا قرآن ہے۔‘‘ اللہ تعالیٰ کریم ہے کیونکہ وہ اجر کریم عطا کرنے والا ہے۔ سورۃ الحدید میں فرمایا: ﴿وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۸﴾﴾ ’’اور اُن کے لیے بڑا باعزّت اجر ہے۔‘‘

(۳۵) اَلرَّقِيْبُ

الرَّقیب (نگہبان‘ نگران) وہ ذات ہے جو ہر شے کی حالت سے بخوبی واقف ہو اور اس کی ایسی نگہبان ہو کہ اس سے کسی وقت بھی غافل نہ ہو پائے اور اس پر لازماً ہمیشہ نظر رکھے۔ قرآن کریم میں ارشادِ ربّانی ہے کہ بروزِ قیامت اللہ تعالیٰ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مجھے اور میری ماں کو بھی اپنا معبود بنا لو؟ تو حضرت عیسیٰؑ جواب دیں گے:

﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾﴾ (المائدۃ)

’’مَیں نے ان سے کچھ نہیں کہا مگر وہی کچھ جس کا تُو نے مجھے حکم دیا تھا (اور وہ یہی بات تھی) کہ بندگی کرو اللہ کی جو میرا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی ربّ ہے۔ اور مَیں ان پر نگران رہا جب تک اُن میں موجود رہا۔ پھر جب تُو نے مجھے اٹھا لیا تو (اس کے بعد) تُو ہی ان پر نگران تھا۔ اور یقیناً تو ہر چیز پر گواہ ہے۔‘‘

سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ﴿۵۲﴾﴾ ’’اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔‘‘ سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴿۱﴾﴾ ’’یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے۔‘‘

(۳۶) اَلْقَرِیْب

ربّ ذوالجلال' القریب ہے۔یعنی وہ ذات جو بندے سے بہت قریب ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے' التجا کرتا ہے' اپنی عرضداشت اس کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔ یہ اسم اس آیت سے لیا گیا ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾﴾ (البقرة)

''اور (اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (ان کو بتا دیجیے کہ) مَیں قریب ہوں۔ مَیں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی (اور جہاں بھی) وہ مجھے پکارے' پس انہیں چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔''

بعض مفسّرین کے مطابق قریب کا معنی یہ ہے کہ علم کے اعتبار سے تمہارے قریب ہوں' کوئی چیز مجھ سے پوشیدہ نہیں۔

جب انسان دنیوی وسائل سے محروم ہوجاتا ہے' اسباب کو اپنے مخالف پاتا ہے اور بے اختیار اللہ کی مدد کو پکارتا ہے تو ساتھ ہی اس کا جواب بھی پاتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے: ﴿..... حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ﴿۲۱۴﴾﴾ (البقرة)

''..... یہاں تک کہ پکار اٹھا رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان کہ کب آئے گی اللہ کی مدد؟ (اب انہیں یہ خوشخبری دی گئی کہ) آگاہ ہوجاؤ' یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔'' سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۶﴾﴾ ''یقیناً اللہ کی رحمت اہلِ احسان بندوں کے بہت ہی قریب ہے۔'' سورۂ سبا میں فرمایا: ﴿اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ﴿۵۰﴾﴾ ''یقیناً وہ خوب سننے والا' بہت قریب ہے۔'' سورۂ ہود میں حضرت صالح علیہ السلام کی زبانی کہلایا گیا: ﴿اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ﴿۶۱﴾﴾ ''یقیناً میرا ربّ قریب ہے اور دعا کا قبول کرنے والا ہے۔'' نبی کی زبان سے ادا شدہ یہ الفاظ اس قرب کو ظاہر کرتے ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام کو بوجہ قبولیت و شرف و اختصاص حاصل ہوتا ہے کہ پروردگار کی طرف سے ان کی حمایت کی جاتی ہے' نصرت فرمائی جاتی ہے اور ان کی معروضات کو درجہ اجابت دیا جاتا ہے۔اسی اسم سے سورۃ قٓ میں لفظ اَقْرَبُ

(قریب تر) استعمال ہوا ہے: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور ہم تو اُس سے اُس کی رَگِ جاں سے بھی قریب تر ہیں۔''

(۳۷) اَلْمُجِیْبُ

یہ اسم عَلَم جواب اور اجابت سے بتایا گیا ہے' یعنی اپنے بندوں کی دعائیں سننے اور قبول کرنے والا۔اللہ عزّوجل' المجیب' وہ ذاتِ اَقدس ہے جو اپنے بندوں کے ہر ایک سوال کو سمجھتا' ان کی دعا کو قبول فرماتا اور ان کی ضروریاتِ طبعی و اتفاقی کو پورا کر دیتا ہے۔ سورۃ النمل (آیت ۶۲) میں فرمایا: ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ﴾ ''بھلا کون ہے جو سنتا ہے ایک مجبور و لاچار کو جب وہ اُس کو پکارتا ہے اور (اُس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے؟'' سورۃ البقرۃ (آیت ۱۸۶) میں فرمایا: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (ان کو بتا دیجیے کہ) میں قریب ہوں۔ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی (اور جہاں بھی) وہ مجھے پکارے''۔ سورۂ ہود میں فرمایا: ﴿اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ﴿۶۱﴾﴾ ''یقیناً میرا ربّ قریب ہے اور دعا کا قبول کرنے والا ہے۔'' سورۃ المؤمن میں فرمایا: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴿۶۰﴾﴾ ''اور تمہارا ربّ کہتا ہے کہ مجھے پکارو' میں تمہاری دُعا قبول کروں گا۔ یقیناً وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبّر کی بنا پر اعراض کرتے ہیں وہ جہنّم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہوکر۔''

صحیحین اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((یَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالٰی كُلَّ لَیْلَةٍ اِلَی السَّمَاءِ الدُّنْیَا حِیْنَ یَبْقٰی ثُلُثُ اللَّیْلِ الْآخِرُ فَیَقُوْلُ: مَنْ یَدْعُوْنِیْ فَاَسْتَجِیْبَ لَهٗ؟ مَنْ یَسْاَلُنِیْ فَاُعْطِیَهٗ؟ مَنْ یَسْتَغْفِرُنِیْ فَاَغْفِرَ لَهٗ؟)) ''ہمارا بلندی و برکت والا ربّ' ہر رات کو جب کہ رات کا آخری تہائی حصہ رہ جاتا ہے آسمانِ دُنیا پر نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے: کون مجھ سے دُعا مانگتا ہے کہ میں اسے قبول کروں؟ کون مجھ سے سوال کرتا ہے کہ میں اسے عطا کروں؟ کون مجھ سے بخشش چاہتا ہے کہ میں اس کو بخش دوں؟''

(۳۸) اَلْوَاسِعُ

'الوَاسِعُ' جس کا علم ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہو' جس کا علم اتنا وسیع تر ہو کہ کوئی شے اس کے علم سے باہر نہ ہو۔ اگر وہ ذات احسان کرے اور نعمت عطا فرمائے تو اس کی بھی کوئی حد نہ ہو۔ بعض علماء کے قول کے مطابق الوَاسِع کا مطلب ایسا غنی ہے جو تمام موجودات سے بے نیاز ہو۔ وسع کا معنی فراخی' تونگری' دسترس اور طاقت کے ہیں' سِعَة بھی انہی معنوں میں آتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ﴾ (آیت ۲۵۵) ''اُس کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو محیط ہے۔'' سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا: ﴿وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ﴾ (آیت ۸۵) ''اور میرا ربّ علم کے اعتبار سے ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔'' سورۃ المومن میں حاملینِ عرش کی دعا کے الفاظ نقل ہوئے: ﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا﴾ (آیت ۷) ''اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔'' سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ﴾ (آیت ۱۵۶) ''اور میری رحمت ہر شے پر چھائی ہوئی ہے۔''

اللہ تعالیٰ واسع ہے لیکن اپنے بندوں کو ان کی وسعت و طاقت سے بڑھ کر کوئی حکم اور آزمائش نہیں دیتا۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ﴾ (آیت ۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ نہیں ذمہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اس کی وسعت کے مطابق۔'' سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۱۵﴾ ''یقیناً اللہ بہت وسعت والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ کی ایک دعا یوں نقل ہوئی ہے: ((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ وَوَسِّعْ لِيْ فِيْ دَارِيْ وَ بَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ)) (رواہ احمد) ''یا اللہ! میرے گناہوں کو بخش دیجیے' اور میرے گھر میں کشادگی کر دیجیے' اور میری روزی میں برکت عطا فرمایئے۔''

(۳۹) اَلْحَكِيْمُ

اَلْحَكِيْم (حکمت والا)' وہ ذات جس کی حکمت کی کوئی حد نہیں ہے' اس لیے کہ اس ذات کا عمل ہر شے پر حاوی اور محیط ہے' اس کے علم اور حکمت کو زوال نہیں ہے اور وہ ہر شے کے اسرار و رموز سے واقف ہے۔ امام راغب اصفہانی کے بقول یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی تمام اشیاء کی مکمل معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں۔ ابن اثیر نے اسم حکیم کو

حکم اور حکمت سے مشتق بتایا ہے۔ البتہ حکیم کا حکمت سے مشتق ہونا سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ حکمت' اعمال میں افضلیت اور افعال میں احسنیت کے علم کو کہتے ہیں۔ حکمت' ان غایات حمیدہ کا نام ہے جو سلسلہ تکوین میں ملحوظ ہیں۔ حکمت' ان مصالح کلیہ کا نام ہے جو نظامِ عالم کا قوام ہیں۔ حکمت کا مفہوم یہ ہے کہ افضل العلوم سے افضل الاشیاء کو معلوم کیا جائے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۲۹﴾ ''اور اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں اٹھائیو ایک رسول خود انہی میں سے جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے۔ یقیناً تُو ہی ہے زبردست اور کمال حکمت والا۔'' سورۃ البقرۃ ہی میں فرمایا: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ﴾ (آیت ۲۶۹) ''وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیرِ کثیر عطا ہو گیا۔'' سورۂ صٓ میں فرمایا: ﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ۝۲۰﴾ ''اور ہم نے اُس (داؤدؑ) کی حکومت کو خوب مضبوط کیا تھا' اور ہم نے اُسے حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بھی۔'' سورۃ النحل میں فرمایا: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (آیت ۱۲۶) ''آپؐ دعوت دیجیے اپنے رب کے راستے کی طرف دانائی اور اچھی نصیحت کے ساتھ۔''

حکمت کی تفسیر میں اقوالِ ائمہ دین کا خلاصہ یوں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حکمت کے معنی علم القرآن بتلائے ہیں' یعنی ناسخ و منسوخ' محکم و متشابہ' مقدم و مؤخر اور حلال و حرام وغیرہ کی شناخت۔ امام مجاہدؒ نے اس کے معنی قرآن' علم اور فقہ بتلائے۔ امام نخعیؒ کے مطابق حکمت معانی الاشیاء اور فہم معانی کا نام ہے۔ امام حسن بصریؒ کا قول ہے کہ دینِ الٰہی میں روح کا نام حکمت ہے۔ امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ جن آیاتِ قرآنی میں کتاب کے ساتھ حکمت کا لفظ آیا ہے' وہاں اس سے مراد حدیث اور سُنّتِ نبویؐ ہے۔ امام مالکؒ کا قول ہے کہ حق کی شناخت اور عمل برحق کا نام حکمت ہے۔ گویا حکمت خیرِ کثیر ہے' حکمت بصیرتِ قلب ہے' حکمت حقیقتِ فطرت ہے اور حکمت غایتِ خلقت ہے۔ لہٰذا حکیم مطلق (اللہ تعالیٰ) ہی کے حکم سے ایمانِ حقیقی والا

قلب ان مراتب کو حاصل کرسکتا ہے۔ اسی لیے عربی میں مشہور عام ہے: فِعْلُ الْحَکِیْمِ لَا یَخْلُو عَنِ الْحِکْمَةِ ''حکمت والے (حکیم) کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا''۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسُلِّطَ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا)) ''قابلِ رشک صرف دو شخص ہیں: ایک وہ جسے اللہ نے مال دیا اور اسے راہِ حق میں خرچ کرنے کی توفیق دی' دوسرے وہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حکمت دی اور وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا اور دوسروں کو تعلیم دیتا ہے۔''

(۴۰) اَلْوَدُوْدُ

اَلْوَدُوْدُ: بڑی محبت کرنے والی ذات۔ وداد کا درجہ محبت سے اعلیٰ ہے۔ وداد کے معنیٰ محبت کی صفائی اور اونچائی ہے۔ محبت کے لب اور خلاصہ کا نام وداد ہے۔ یہ محبت کا وہ درجہ ہے جو اخلاص سے حاصل ہوتا ہے اور اغراض کے دھوکے کے شائبہ سے بھی پاک ہے۔ ودود کے معنی مودود کے بھی ہیں' یعنی وہ ذات جس سے محبت کی جائے' جس کو دل کا نقد نذرانہ پیش کر دیا جائے اور اس سے محبت کا شدید تعلق پیدا کیا جائے۔ اسی طرح ودود کے معنی وَادٌّ کے بھی ہیں یعنی وہ ذات جو ہم سے محبت کرتی ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی الجامع الصحیح میں ہر دو معانی کے اعتبار سے ودود کا ترجمہ حبیب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ بابرکت ذات ہے جو اپنے بندوں سے خود بھی محبت کرتا ہے اور اس کے بندے بھی اس سے محبت کرتے ہیں' یعنی محبت کا وجود ہر دو جانب محقق و مسلّم ہے۔ سورۃ المائدۃ (آیت ۵۴) میں اسی حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ ''جنہیں اللہ محبوب رکھے گا اور وہ اُسے محبوب رکھیں گے۔'' حضرت شعیب علیہ السلام کی زبانی سورۂ ہود میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰﴾ (آیت ۹۰) ''اور استغفار کرو اپنے رب سے' پھر اُس کی طرف رجوع کرو۔ یقیناً میرا رب رحیم بھی ہے' محبت فرمانے والا بھی۔'' سورۂ مریم میں فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝۹۶﴾ ''یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے' عنقریب ان کے لیے رحمٰن (لوگوں کے دلوں میں) محبت پیدا کر دے گا۔''

پروردگار سراپا محبت تو ہے ہی لیکن اُس ذات کا وَدُود ہونا اس سے بڑھ کر ہے۔ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اول تو وِدَاد کا درجہ محبت سے بڑھ کر ہے' پھر ربّ کائنات نے اس صیغہ کے اسم مبالغہ کو اپنے لیے پسند فرمایا۔ اس سے بڑھ کر وُدّ اور سراپا محبت کو اپنے بندوں کے لیے خاص فرما دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی ایک دعا یہ تھی: ((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَالْعَمَلَ الَّذِيْ يُبَلِّغُنِيْ حُبَّكَ)) (رواہ الترمذی) ''اے اللہ! میں آپ سے آپ کی محبت مانگتا ہوں' اور جو کوئی آپ سے محبت کرتا ہے' اس کی بھی محبت میں مانگتا ہوں' اور اس عمل کی محبت بھی مانگتا ہوں جو مجھے آپ کی محبت سے قریب اور نزدیک کر دے۔''

(۴۱) اَلْمَجِیْدُ

مجد' پایۂ بلند' مرتبہ عالی' شرفِ واسع' شرفِ نسب اور شرفِ افعال کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ مجید وہ ہے جس ذات میں درج بالا صفات پائی جائیں۔ مجید وہ ہستی ہے جس میں مجد نفسی' شرفِ ذاتی' سلامتِ افعال' کرامتِ افضال' جزالتِ عطا اور کثرتِ نوال پائی جائے۔ 'المجید' وہ ذات جو انتہائی عزت و شرف کی مالک ہو' جو تمام موجودات میں سب سے بلند تر اور بلند قدر ہو' جس ہستی کی ذات شریف ترین' افعال پسندیدہ ترین اور اس کی عطا گراں قدر ہو۔ المجید (شرف و بزرگی' خوبیوں اور شان والا)' ربّ العزّت کے علاوہ اور کوئی ذات ہو ہی نہیں سکتی جس میں کہ مندرجہ بالا خوبیاں پائی جاتی ہوں۔ سورۂ ہود میں فرمایا: ﴿اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝۷۳﴾ ''یقیناً اللہ لائق حمد اور بزرگی والا ہے۔'' سورۃ البروج میں فرمایا: ﴿وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝۱۴ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۝۱۵﴾ ''اور وہ بخشنے والا بھی ہے' محبت کرنے والا بھی ہے۔ عرش کا مالک ہے' بڑی شان والا ہے۔'' سورۂ قٓ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿قٓ ۣ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝۱﴾ ''قٓ' قسم ہے عظیم الشان قرآن کی۔''

(۴۲) اَلشَّهِیْدُ

شہادت عربی میں درست آگاہی' خبر قاطع' بیان صحیح' گواہی اور خدا کی راہ میں قربان ہونے کو کہتے ہیں۔ مجاہدؒ نے شَهِدَ کے معنی حکم و قضا بیان کیے ہیں۔ زجاج نے بَیَّن بتلائے اور دیگر علماء کا قول اَعْلَمَ وَاَخْبَرَ کا ہے۔ گویا ان آراء سے واضح ہوتا ہے کہ شہادت حکم و قضا اور اعلام

و بیان واخبار کا نام ہے۔ اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ کا اسم پاک الشَّہِید ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیات میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾﴾ ''اللہ خود گواہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور سارے فرشتے (گواہ ہیں) اور اہلِ علم بھی (اس پر گواہ ہیں)' وہ عدل وقسط کا قائم کرنے والا ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ زبردست ہے' کمال حکمت والا ہے۔'' ﴿قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾﴾ ''اللہ تعالیٰ نے کہا: اچھا اب تم بھی گواہ رہو اور مَیں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔'' سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اے اہلِ ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر خواہ یہ (انصاف کی بات اور شہادت) تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین کے یا تمہارے قرابت داروں کے۔''

اللہ عزوجل' الشَّہِید ہے' کیونکہ اپنی مخلوقات کے ساتھ ہر جگہ اور ہر لمحہ موجود ہے۔ شہید کے معنی حاضر رہنے والا اور گواہی دینے والا بھی لیے جاتے ہیں۔ سورۃ المائدۃ میں فرمایا: ﴿وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾﴾ ''اور یقیناً تُو ہر چیز پر گواہ ہے۔'' سورۃ الزخرف میں فرمایا: ﴿وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾﴾ ''اور کوئی اختیار نہیں رکھتے کسی بھی شفاعت کا جن کو یہ پکار رہے ہیں اللہ کے سوا' سوائے اُس کے کہ جو حق کی گواہی دیں اور وہ جانتے ہوں۔''

اللہ تعالیٰ کا اسم پاک 'الشَّہِید' اس لیے ہے کہ شہود اسی ذات کو حاصل ہے اور اس لحاظ سے شہید بمعنی حاضر وناظر ہے۔ اللہ تعالیٰ 'شہید' ہے کہ اس نے علوم معرفت اور اسرار حقیقت کا اعلام فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ شہید ہے کہ عالَم (کائنات) کی کوئی شے' کوئی سکون' کوئی حرکت اس کی شہادت سے باہر نہیں۔ سورۂ سبا میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۴۷﴾﴾ ''اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔''

(جاری ہے)

❁❁❁

ہماری مطبوعات

حاصل مطالعہ از پروفیسر الطاف طاہر اعوان

نام کتاب : سیرت النبی ﷺ اور ہماری زندگی

مؤلف : ڈاکٹر اسرار احمدؒ

صفحات (جلد اول) : 516 ہدیہ سیٹ (مکمل تین جلد) : 2500 روپے

شائع کردہ: مکتبہ خدام القرآن لاہور' فون: 042-35869501-3

ڈاکٹر اسرار احمدؒ پیشے کے لحاظ سے ایک جسمانی طبیب جبکہ مشن کے لحاظ سے ایک روحانی معالج تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے میرا پہلا تعارف ۱۹۷۲ء میں ہوا۔ وہ جوہر آباد' ضلع خوشاب تشریف لائے جہاں ان کے برادر بزرگوار انجینئر اظہار احمد قریشی ایک صنعتی ادارے کے مالک' دارالاسلام ٹرسٹ کے چیئرمین اور جماعت اسلامی کے قائد تھے۔ اظہار احمد قریشی مرحوم ایک متقی' نیک دل' انسان دوست' خادم اسلام' مخیر شخصیت تھے۔ ڈاکٹر صاحب انہی سے ملاقات کے لیے جوہر آباد تشریف لائے تھے۔ اسلامی جمعیت طلبہ نے موقع غنیمت جان کر مرکزی جامع مسجد میں ڈاکٹر صاحب کو سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر تقریر کی دعوت دے دی۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک کارکن کی حیثیت سے میں بھی انتظامات میں شریک تھا۔ ہمیں تمام دینی حلقوں کی حمایت حاصل تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے خطاب نے سامعین پر گہرا اثر ڈالا۔ دوسرے دن انہیں جناب شاہ محمد امین عطا فاروقی نے جامع مسجد دارالاسلام میں درسِ قرآن کی دعوت دی۔ نہ صرف طلبہ واساتذہ بلکہ سول لائنز اور مضافاتی آبادیوں سے بھی لوگ درسِ قرآن میں شریک ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے سورۃ العصر کا درس دیتے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ دن اور آج کا دن' ۵۳ سال کے اس عرصہ میں ڈاکٹر صاحب' ان کا درس' ان کی خطابت' قرآن مجید سے ان کے لگاؤ'

نبی کریم ﷺ کے اتباع کے جذبہ سے سرشار شخصیت ہمیشہ میرے لیے مشعلِ راہ رہی ہے۔

ربیع الاول ۱۴۴۷ھ کے ماہِ مقدس میں پروفیسر نثار احمد ملک کے توسّط سے مدیر ''میثاق'' حافظ خالد محمود خضر کی جانب سے موصول ہونے والے دل کش، دل ربا خوب صورت تحفہ کی صورت میں ڈاکٹر صاحب موصوفؒ کی تین جلدوں پر مشتمل ''سیرت النبی ﷺ سیریز'' کا سیٹ میرے زیر مطالعہ ہے۔ فی الحال میں اس کی پہلی جلد کا مطالعہ کر سکا ہوں۔ دوسری جلد کا آغاز کرنے سے پہلے قارئین کو اپنے تاثرات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ اسے تعارف وتبصرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

سیرت النبیؐ سیریز سیٹ کی پہلی جلد کو ''سیرت النبی ﷺ اور ہماری زندگی'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ یہ دراصل ڈاکٹر صاحب کی ۹ کتب کا مجموعہ ہے جو ''رسولِ اکرم ﷺ اور ہم'' کے مستقل عنوان سے ایک جلد میں شائع ہوتی ہیں۔ کتاب کا آغاز ''عظمتِ مصطفیٰ ﷺ'' کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا ایک جامع خطاب ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کی عظمت بحیثیت ایک داعیٔ انقلاب کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

کتاب کے دوسرے باب کا عنوان ''رسولِ کامل ﷺ'' ہے، جو بارہ تقاریر پر مشتمل ہے۔ ان تقاریر میں ڈاکٹر صاحب نے نبوت ورسالت کی غرض وغایت، رسولِ اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر اس کے انقلابی پہلو کو اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ''نبی کریم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' ہے جو ڈاکٹر صاحب کے دو مقالوں پر مشتمل ہے۔ ان میں نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت قرآن حکیم کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ نیز بعثتِ انبیاءؑ کا اساسی مقصد اور بعثتِ محمدیؐ کی اتمامی اور تکمیلی شان پر علمی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔

چوتھے باب کا عنوان ''نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں'' ہے۔ اس میں نبی مہربان ﷺ پر ایمان، آپ کی توقیر، اطاعت، محبت، اتباع، نصرت اور اتباعِ قرآن مجید کی وضاحت کی گئی ہے۔ دینِ حق کے لیے نبی کریم ﷺ کو پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

''سورۃ الاحزاب کی روشنی میں اُسوۂ رسول ﷺ'' ڈاکٹر صاحب کے ایک طویل درس پر

مشتمل باب ہے جس میں نبی مہربان ﷺ کی استقامت، کفّار کی سازشوں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اطاعت واتباعِ رسولؐ، اخوت وایثار کو بیان کیا گیا ہے۔

''حُبِّ رسول ﷺ اور اس کے تقاضے'' میڈیکل کالج کے طلبہ سے ایک مختصر، مگر جامع خطاب ہے، جس میں حُبِّ رسول ﷺ، اتباعِ رسول ﷺ، نبی کریم ﷺ کا مقصدِ بعثت اور دورِ حاضر میں انقلاب اسلامی کے طریقِ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

''معراج النبی ﷺ'' کے عنوان سے خطاب میں نبی کریم ﷺ کے سفرِ معراج کو قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور عقلی دلائل سے اس محیّر العقول واقعہ کے استبعاد کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب'' اس سارے سلسلے کا عرق اور عطر ہے جس سے پورا ماحول معطر ہو جاتا ہے اور سامع وقاری جھوم اٹھتا ہے۔ اس خطاب کو دراصل ڈاکٹر صاحب کی ضخیم تالیف ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کے خلاصے اور نچوڑ کی حیثیت حاصل ہے، جو ان کے گیارہ خطاباتِ جمعہ پر مشتمل ہے۔

کتاب کا آخری باب ''ختمِ نبوت کے دو مفہوم اور تکمیلِ رسالت کے عملی تقاضے'' کے عنوان سے ایک مختصر مگر جامع خطاب ہے۔ یوں ۵۱۶ صفحات پر کتاب مکمل ہو جاتی ہے۔

یہ کتاب نہ صرف قرآن وسنّت کی تعلیمات کا مجموعہ ہے بلکہ ادبی شاہ پارہ بھی ہے جس میں عربی، فارسی اشعار اور کلام اقبال دل کو کھینچتا ہے۔ سونے پر سہاگا ڈاکٹر صاحب مرحوم کا انداز خطابت، الفاظ کی گھن گرج، آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی سے برمحل دلائل نے کتاب کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

راقم کے خیال میں نسلِ نو کو سیرتِ نبوی ﷺ کے پیغام سے آگاہ کرنے کے لیے اس سے اچھا تحفہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ گرانی کے اس دور میں اتنی کم قیمت میں تین خوب صورت مجلدات پر مشتمل کتاب قرآن اکیڈمی کے ذمہ داران کے حُبِّ رسول ﷺ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ یہ کتاب گھر بیٹھے ۵۰ فیصد رعایت پر، کیش آن ڈیلیوری کی سہولت کے ساتھ، حاصل کر سکتے ہیں۔ (برائے رابطہ: 0301-1115348) اس کتاب کا ہر گھر میں ہونا اور روزانہ نمازِ عشاء کے بعد پورے کنبے کی موجودگی میں اجتماعی مطالعہ ایک اہم ضرورت ہے۔ ❁❁

Nov 2025
Vol.74

Regd. CPL No.115
No.11

Monthly Meesaq Lahore

تنظیم اسلامی کا پیغام

خلافتِ راشدہ کا نظام

بانی تنظیم: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

إِنْ شَاءَ اللّٰہ

امیر تنظیم: شجاع الدین شیخ

متبادل سالانہ اجتماع

برائے زون شرقی پاکستان

لاہور شرقی، لاہور غربی
گوجرانوالہ، سرگودھا

تاریخ: ہفتہ 15 نومبر صبح 9 بجے تا اتوار 16 نومبر 2 بجے

رابطہ: 042-35473375-78

تمام رفقاء تنظیم اسلامی کی شرکت مطلوب ہے

بمقام: دارُ الاِسلام مرکز تنظیمِ اسلامی لاہور

www.tanzeem.org